حیدرآباد میں اردو صحافت

طیب انصاری



حیدرآباد میں اردو صحافت

۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۹ء

طیب انصاری

بارِ اول	پانچ سو
تاریخ اشاعت	جون سنہ ۱۹۸۰ء
کتابت	عارف الدین، انور احمد
سرِورق	غوث محمد
قیمت	بتیس ۳۲ روپے
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد
ٹائٹل	انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد

بہ اعانت

محکمۂ تعلیمات، حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد

~~اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، حیدرآباد~~

ملنے کے پتے

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

اعجاز پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

شالیمار پبلیکیشنز، نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶

مکرم و محترم جناب **محبوب حسین جگر**

کے

نام

جنھوں نے

اردو کی جمہوری صحافت کو وقار اور اعتبار عطا کیا

مصنف کی دیگر تصانیف

۱)	تحریر و تنقید	تنقید	۳/۵۰	روپیہ
۲)	ادراکِ معنیٰ	"	۶/=	"
۳)	میرا شہر میرے لوگ	خاکے	۵/=	"
۴)	یارانِ شہر	"	۱۰/=	"
۵)	قطبِ دکن	سوانح (مشترکہ تالیف)	۷/=	"

زیرِ ترتیب

نصرتی کی شاعری	تنقید
اقبال فہمی	"
حرف شناسی	"
غالب فہمی	"

ترتیب

حصہ اوّل

حصّہ دوّم

حصّہ سوم

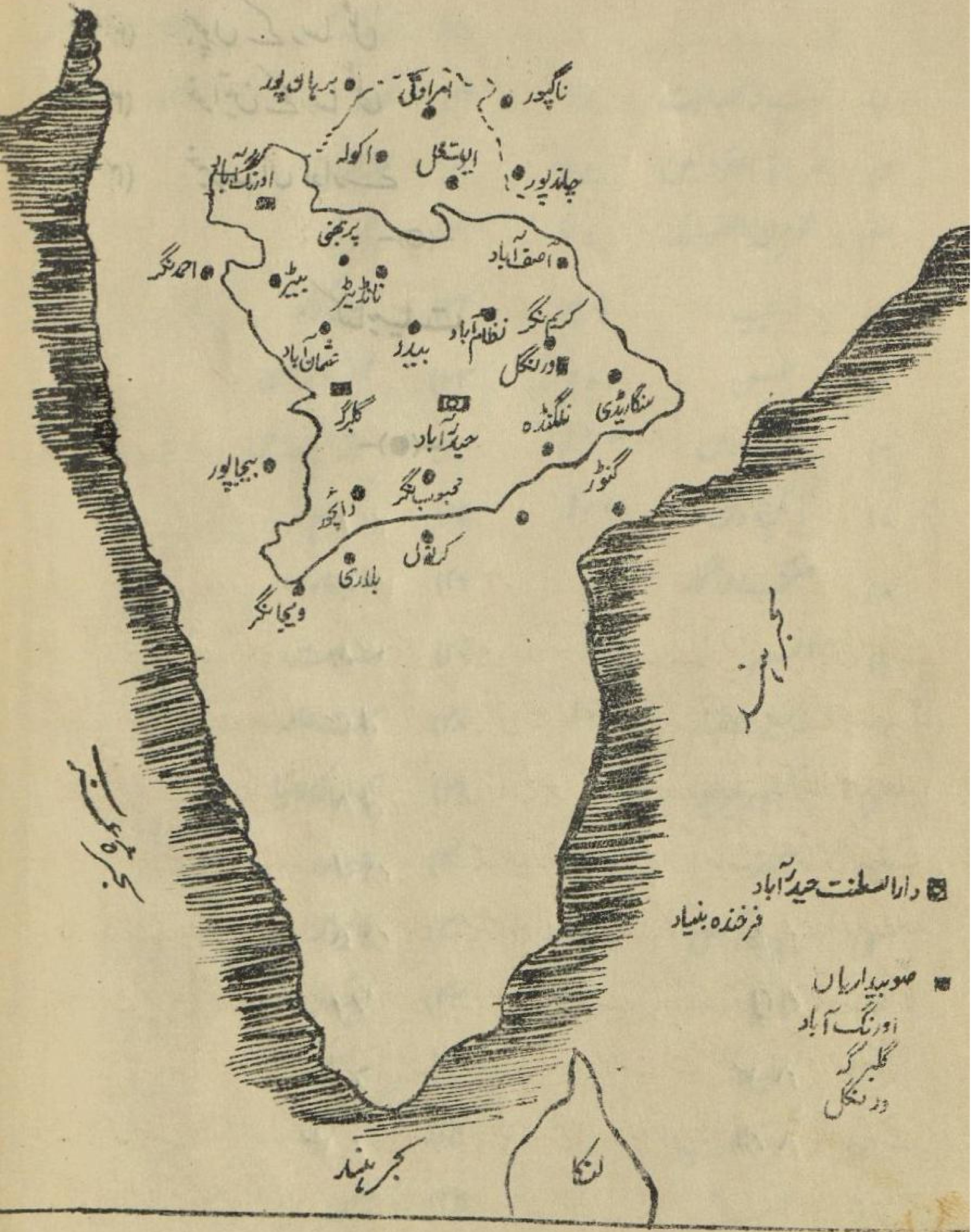
۱) اضلاع کے رسائل
۲) بچوں کے رسائل
۳) خواتین کے رسائل
۴) خبررساں ادارے

-(٥)-

کتابیات

-(●)-

مملکت آصفیہ
۱۷۲۴ء تا ۱۹۴۸ء



پیش لفظ

شہر اُردو حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی پہلی اینٹ اُردو شعر و تہذیب کے اوّلین محسن، والئ سلطنت گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ معانی نے سنہ ۱۰۰۰ھ میں رکھی تھی لیکن تقریباً پورے تین سو سال کے بعد عہدِ آصفی میں حیدرآباد سے پہلی بار ایک طبی رسالہ ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا گویا صحت مند صحافت کا آغاز ہوا تھا۔ رسالہ طبابت کی اشاعت کے تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں حیدرآباد کا پہلا اخبار "آفتابِ دکن" قاضی محمد قطب کی ادارت میں جاری ہوا۔ اسطرح رسالۂ طبابت حیدرآباد کی اُردو صحافت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کے بعد جو عمارت تعمیر ہوئی وہ ہر طرح مضبوط، پائیدار اور خوبصورت ہے۔ حیدرآباد کی اس طویل صحافتی خدمت کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ان تاریخوں میں بھی نہیں جو ہندوستان کی اُردو صحافت سے متعلق ہیں۔ خود حیدرآباد میں بھی اس جانب توجہ نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ چند ادبی مورخین نے حیدرآباد کی ادبی و ثقافتی تاریخ لکھتے ہوئے اجمالاً صحافت کا بھی ذکر کیا ہے

میں نے ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران اپنے مقالہ کا موضوع "حیدرآباد کے اردو رسائل" منتخب کیا تھا۔ ایم۔ اے کی تکمیل کے فوری بعد استاد گرامی ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب کی ایما پر اس کو وسعت دے کر پی ایچ۔ ڈی کیلئے "حیدرآباد میں اردو صحافت" کا موضوع چنا تھا ابھی کام کا آغاز بھی ہونے نہ پایا تھا کہ گلبرگہ کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے میرا تقرر ہوگیا اور اسکے بعد خود مسعود صاحب حیدرآباد سے علیگڈھ منتقل ہوگئے اس کا نقصان شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ کو جو ہونا تھا وہ تو ہوا مگر میں پی ایچ۔ ڈی ہونے سے رہ گیا۔ تاہم ان ہی کی ایما و ہدایت پر میں نے اس کام کو جاری رکھا اور مسلسل گیارہ، بارہ سال کی محنت، جستجو اور تحقیق کے بعد یہ کام اب منظر عام پر آیا ہے۔

میری یہ تحقیق کوئی کارنامہ تو نہیں البتہ ایک علمی و ادبی خدمت ضرور ہے اور اسی حیثیت سے اس کا جائزہ لینا ہوگا۔ ویسے بھی تحقیق کی دنیا میں کوئی حرفِ آخر نہیں ہوتا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس موضوع پر پہلی مرتبہ ایک مبسوط مقالہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا پورا احساس ہے اور یہ احساس بھی کہ میں نے اس اچھوتے موضوع پر قلم اٹھا کر جرأت مندی کا ایک اولین ثبوت دیا ہے اور یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ مجھے شہر حیدرآباد سے بے پناہ محبت ہے یہ بات جتانے کی نہیں تھی مگر جذبۂ محبت اظہار کے لیے بے چین ہے "میرا شہر میرے لوگ" اور "یارانِ شہر" کی تصانیف میں یہی جذبہ کارفرما ہے۔ ہاں! ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ "حیدرآباد میں اردو صحافت" سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میری ان دونوں کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں۔ ان کتابوں میں شامل بیشتر خاکے ان ہی شخصیات کو نمایاں کرتے ہیں جو تاریخِ اردو صحافت کے روحِ رواں تھے یا ہیں!

موضوع کی وسعت، اہمیت اور پھیلاؤ کے پیشِ نظر میں نے اپنی موجودہ تحقیق کو ۱۹۶۰ء تک محدود کر دیا ہے اس طرح یہ حیدرآباد میں اردو صحافت کے پچھلے سو برس کی تاریخ پیش کرتی ہے ارادہ ہے کہ اس کام کو جاری رکھوں گویا جدید دور کے اخبار و رسائل کا کام مجھ پر قرض رہے گا۔ میرے لیے ضروری ہے کہ میرے استاد جناب اکبر الدین صدیقی، احباب اور اردو کے شعراء جناب صلاح الدین نیر اور جناب وقار خلیل اور بزرگ صحافی جناب شبلی یزدانی کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے۔

مصنف:۔ 19-8 خیریت آباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ ۶۸۔۶۔۲ حیدرآباد

اردو اخباروں کا تہذیبی، سماجی سیاسی، مذہبی اور ادبی پس منظر

(۱۸۶۰ء تا ۱۹۵۹ء)

حیدر آباد کے اردو اخباروں کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ جگہ جگہ کی مختلف قسم کی خبریں شائع کر کے عوام کی دلچسپی اور ان کے معلومات میں اضافہ کیا جائے بلکہ ان میں اصلاح حال کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے فکر و رائے کی صحیح سمت میں رہنمائی کی جائے تاکہ ملک و قوم کے مسائل حل کرنے میں رائے عامہ کی تعمیر و تشکیل میں مدد ملے۔ ان ہی اخباروں کی بدولت گھر گھر علم و دانش کے چراغ روشن ہوئے، شعر و ادب کی محفلیں آراستہ کی گئیں اور جب ابتلاء و مصائب کے طوفان آئے تو ڈگمگاتے قدموں کے لئے نئی زمینیں ہموار کی گئیں۔ اس زمانہ کے جرائد و اخبار کہنے کو تو خبرنامے تھے لیکن خبروں کی فراہمی اور اشاعت کچھ اس طرح ہوتی کہ حکومت بھی چونک پڑتی اور اس کو اندیشہ ہوتا کہ بعض امور میں رائے عامہ اس کے خلاف نہ ہو جائے۔

قومی تحریکیں ہوں کہ انفرادی کوششیں، سبھی ان اخباروں کے ذریعے پھلتی اور

پھولتی رہیں۔ دیوانوں کے خوابوں کی تعبیر بھی ان ہی اخباروں سے ملی۔

یہ اخبار درحقیقت صحیفے ہیں، اعلیٰ قدروں اور اعلیٰ اصولوں کے! آج کے اس جمہوری اور عوامی دور ہیں جو ہمہ جہتی ترقیاں ہو رہی ہیں ان میں بلاشبہ ان اخباروں کا اہم کردار ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب کو سمجھنے، یہاں کے ماحول سے قریب ہونے اور حیدرآباد کی ادبی، لسانی، معاشی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، اور ادبی وسیاسی زندگی کے لیل ونہار کے مطالعہ کے لئے ان اخباروں کا پڑھنا بے حد ضروری ہے۔ اور ان کے مطالعہ حوالے کے بغیر حیدرآباد کی تاریخ لکھی بھی نہیں جاسکتی۔

ویسے تو حیدرآباد سے اخباروں کی اشاعت کا آغاز قاضی محمد قطب کے اخبار "آفتاب دکن" (۱۸۶۰ء) سے ہوتا ہے، لیکن جہاں تک حیدرآباد کی اردو صحافت کا تعلق ہے اس کی ابتدا ۱۸۵۹ء میں رسالہ طبابت کی اشاعت سے ہو گئی تھی۔ اس رسالہ کا مقصد طب سے متعلق مفید مضامین کی اشاعت اور امراض و مریضوں کے بارے میں ضروری معلومات و اطلاعات شائع کرنا تھا۔ رسالہ طبابت کی اشاعت کی اس غرض و غایت کے پیش نظر میں یہ حکم لگانے کے موقف میں ہوں کہ حیدرآباد کی اردو صحافت کا آغاز کسی سیاسی، مذہبی اور ادبی تقاضہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ سائنسی اور طبی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ اس کی بنیاد طب اور سائنس پر رکھی گئی، جب صحافت کی یہ عمارت تعمیر ہوئی تو اس کے باب الداخلہ پر رنگ برنگ کے گل بوٹے بنائے گئے، اور عمارت کے مختلف گوشوں میں کہیں رقص وسرور کی محفلیں آراستہ ہوئیں اور کہیں مشاعروں اور ادبی مجلسوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ اور کہیں زندہ باد اور مردہ باد کے فلک شگاف نعرے بھی بلند ہوئے اور کہیں منبر پر بیٹھے واعظ نے اخلاق و تمدن کا درس دیا ہے۔

قاضی محمد قطب کے "آفتاب دکن" کے تعلق سے ضروری معلومات فراہم نہ ہوسکیں لیکن قاسم علی سجن لال صاحب نے اس کو حیدرآباد سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار قرار دیا ہے۔ انھوں ہی نے ایک اور جریدہ الاعلامیہ کا بھی ذکر کیا ہے جو زین العابدین

شیرازی کی ادارت میں ۱۸۶۹ء میں جاری ہوا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق یہ جریدہ حیدرآباد اسٹیٹ کا گزٹ تھا۔ ابتدا میں فارسی میں شائع ہوا کرتا تھا پھر اردو میں شائع ہونے لگا۔ یہ جریدہ ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ اس کے پہلے مدیر زین العابدین شیرازی تھے۔ سجن لال صاحب کے بیان سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی روزنامہ نہیں بلکہ ماہوار یا ہفتہ وار سرکاری گزٹ ہوگا۔ سید انوار الحق جعفری کے بیان کے مطابق جو خود بھی حیدرآبادی صحافت سے عرصہ دراز تک وابستہ رہے ہیں۔ دکن میں صحافت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری بیس پچیس سال میں ہوئی۔ نیز ان کے بیان کے مطابق سب سے پہلا اخبار ۱۸۷۷ء میں "خورشید دکن" حیدرآباد کا پہلا اخبار ضرور تھا لیکن پہلے روزنامہ کی حیثیت ہزار داستاں کو حاصل ہے جو ۱۸۸۳ء میں سلطان محمد عاقل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ عرصہ دراز تک ہم حاجی کرتان کے اخبار شوکت الاسلام ۱۸۸۸ء کو پہلا اردو اخبار سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن مولوی محمد مہدی کے مضمون "حیدرآبادی صحافت کی تاریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روزنامہ نہیں ہفتہ وار اخبار تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اخبار شوکت الاسلام جو اب تک کبھی کبھار شائع ہوتا رہتا ہے۔ ابتداً غالباً ۱۲۹۷ھ میں بمقام مدراس زیر ادارت مولوی حاجی کرتان صاحب شائع ہوا۔ ۱۳۰۰ھ میں حیدرآباد منتقل ہوا۔ کہنے کو تو یہ ہفتہ وار ہے مگر برائے نام ہی ہے، کبھی ٹھیک وقت پر شائع نہیں ہوتا۔"

بہرحال سجن لال صاحب کی تحقیق کے مطابق "آفتاب دکن" حیدرآباد سے جاری ہونے والا پہلا اردو روزنامہ قرار پاتا ہے۔ آفتاب دکن، خورشید دکن، ہزار داستان کے بعد متعدد اخباروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ کے اخباروں میں پیک آصفی، سفیر دکن، افسر الاخبار، اخبار آصفی اہم اخبار ہیں۔ پیک آصفی ۱۸۸۳ء میں جشن بلگرامی نے جاری کیا اور اس اخبار کو ڈیڑھ ہزار روپے کی سرکاری گرانٹ منظور تھی۔ اس کثیر رقم کی منظوری سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کی شاہی

حکومت اخباروں کی اشاعت کی ہمت افزائی عملاً کرتی تھی۔ سفیر دکن ۱۸۸۵ء میں ایک اور اخبار "اخبار آصفی" بھی جاری کیا تھا۔ افسر جنگ تھے تو فوجی عہدیدار لیکن انھیں سماج کی تہذیبی قدروں سے اُنس تھا، وہ علم وادب کے شیدائی تھے چنانچہ افسر الاخبار (۱۸۸۶ء) کی اجرائی ان کے اسی ادبی، علمی ذوق کی نشان دہی کرتی ہے کچھ مدت کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا پھر انھوں نے ماہنامہ "افسر" ۱۸۹۷ء میں جاری کیا تھا۔

آفتاب دکن، خورشید دکن، جریدہ الاعلامیہ، ہزار داستان، سفیر دکن، اخبار آصفی، اور افسر الاخبار حیدر آبادی اردو صحافت کی تاریخ کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان جارج اسمتھ کے رسالے طبابت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مشیر دکن ۱۸۹۲ء کشن راو آنجہانی نے جاری کیا۔ اور آج تک بھی یہ جاری ہے۔ اس لحاظ سے مشیر دکن حیدر آباد کا قدیم ترین اخبار ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں شاید ہی اتنے دیرینہ سال اخبار موجود رہے ہوں۔ البتہ اس اخبار کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا ماضی تو بڑا درخشاں رہا ہے لیکن حال بڑی کس مپرسی کا شکار ہے۔ آج اس کی اپنی کوئی مبسوط اور مکمل پالیسی نہیں ہے۔ مولوی محمد مہدی نے "مشیر دکن" کے بارے میں لکھا ہے:

> "موجودہ عہد کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ دکن پنچ ۲۸ر فروری ۱۸۸۷ء کو جاری ہوا۔ اور ہر انگریزی مہینے کی ۷، ۱۴، ۲۱، اور ۲۸ کو شائع ہوتا تھا۔ ۱۲ر مارچ ۱۸۹۲ء سے بجائے دکن پنچ ماہواری رسالہ کی صورت میں نکلنے لگا مگر چار پانچ مہینے کے بعد دکن پنچ بند ہوگیا۔ مشیر دکن ۲۲ر اپریل ۱۸۹۲ء سے ۱۰ر ڈسمبر ۱۸۹۸ء تک روزانہ نکلتا رہا، اس کے بعد بند ہوگیا۔ ۱۸۹۹ء میں پھر دوبارہ روزانہ شائع ہونے لگا۔"

اس اخبار نے اعتدال پسندی، سلامت روی اور صلح کل جیسی پالیسی سے کبھی انحراف نہیں کیا۔" بقول محترمہ زینت ساجدہ۔ یہی وجہ ہے کہ مشیر دکن کو سرکاری حلقوں میں جو مقبولیت حاصل رہی وہ بہت کم کسی اخبار کو نصیب ہوئی ہوگی۔" کسی قابل اعتراض مضمون کی اشاعت کی وجہ سے البتہ کشن راؤ آنجہانی کو شہر بدر کیا گیا تھا۔ یہ ۱۸۹۸ء کی بات ہے، کچھ مدت تک یہ اخبار مدراس سے نکلتا رہا اور پھر دوبارہ ۱۸۹۹ء میں حیدرآباد سے شائع ہونے لگا۔

روزنامہ "علم و عمل" ۱۹۰۲ء میں صادق حسین نے جاری کیا۔ اس اخبار کے اجراء سے قبل ۱۹۰۱ء میں رسالوں اور اخباروں کی کل تعداد (۱۴) تھی جن میں سے (۱۲) اردو اور (۲) اردو مراٹھی میں تھے۔ ان (۱۴) اخباروں میں سے (۷) روزنامے تھے۔ آج ان (۷) روزناموں سے صرف مشیر دکن ہی ایسا اخبار ہے جس کے تفصیلات ملتے ہیں۔ اور جس کی پالیسی کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ مشیر دکن کے اجرا کے بعد تو ہماری صحافت ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ روزنامے روزمرہ زندگی کے ضروریات میں داخل ہو چکے تھے ان کی آواز کی قدر و قیمت تھی اور وہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے بھی جانے لگے تھے۔ صادق حسین کے بعد محب حسین نے ۱۹۰۴ء میں "علم و عمل" کی ذمہ داری کو قبول کیا اور اس ذمہ داری کو کچھ اس طرح نبھایا کہ آج ہم ان کے کارناموں پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ روزنامہ "علم و عمل" میں جو خبریں دی گئی ہیں ان کے کوئی حوالے نہیں ملتے اور نہ ہی کسی خبر رساں ایجنسی کا نام دیا جاتا تھا۔ ویسے بھی یہ ایسا دور تھا جب کہ لوگ سیاسی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ سیاسی شعور بیدار نہیں ہوا تھا اور بادشاہ سلامت "ظل سبحانی" کا درجہ رکھتے تھے۔ اس لئے سیاست کسی بھی عام فرد کی دسترس سے بالاتر تھی، محب حسین نے کیشو راؤ کوٹکر، وامن نائک، ملا عبدالقیوم، ڈاکٹر رگھورناتھ چٹوپادھیا، پنڈت تارا ناتھ، بیرسٹر سری کشن اور بیرسٹر محمد اصغر کی طرح ریاست حیدرآباد میں

میں کانگریس تحریک کے آغاز اور ارتقا کے لئے فضا کو سازگار بنایا ہے ۔ یہ ان کے ایسے کارنامے ہیں جن کا ذکر کئے بغیر نہ ہی صحافت کی تاریخ اور ہندوستانی سیاست کی تاریخ مکمل کہلائی جاسکتی ہے ۔

ملا عبد الباسط نے ١٩١١ء میں "معارف" جاری کیا ۔ ملا عبد الباسط حیدر آباد کی صف اول کی سیاسی اور صحافی شخصیتوں میں شمار کئے جاتے رہے ہیں ۔ یہ روز نامہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا ۔ ١٩١١ء میں عبد الحی اور سید رضا شاہ نے "عثمان گزٹ" اور ١٩١٢ء میں مولوی اکبر علی نے روز نامہ "صحیفہ" جاری کیا ۔ "صحیفہ" اپنی نوعیت کا منفرد اخبار تھا جو صحافت کی پوری ذمہ داریوں کو پورا کرتا تھا ۔ اکبر علی غیر معتبر خبروں کو شائع نہیں کرتے تھے چنانچہ جب حضور نظام اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں شمالی ہند کے دورہ پر گئے تو یہ بھی ساتھ تھے تاکہ انھیں صحیح اور مکمل خبریں ملیں ۔ وہ روزآنہ "صحیفہ" کے لئے ڈسپاچ بھیجتے تھے ۔ ان تازہ بتازہ خبروں کی وجہ سے "صحیفہ" کی مقبولیت بڑھ گئی تھی ۔ مولوی اکبر علی کے انتقال کے بعد مولوی محمد مظہر نے چار سال تک "صحیفہ" کی ذمہ داری کو سنبھالا ۔ صحیفہ خادم ادب تو تھا ہی یہ دور آصفی کا سب سے پہلا خادم ملک و ملت ہونے کا دعویدار بن گیا ۔

روز نامہ "صحیفہ" کے ساتھ ساتھ جس اخبار نے شہرت حاصل کی اور آگے چل کر اپنا ایک بڑا اور مخصوص حلقہ بنالیا ۔ وہ روز نامہ "رہبر دکن" ہے جسے احمد محی الدین نے ١٩٢٠ء میں جاری کیا تھا ۔ حیدر آباد کا یہ ممتاز اخبار حیدر آباد کی سیاسی تبدیلی تک زندہ رہنے کے بعد ستمبر ١٩٤٨ء میں بند ہوگیا ، لیکن نو ماہ بعد جولائی ١٩٤٩ء میں منظور حسن صاحب انصاری کے نام سے نئے اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کیا گیا ۔ یہی "رہبر دکن" اب "رہنمائے دکن" کے نام سے جاری ہے ١٩٦٠ء میں منظور حسن صاحب نے علیحدگی اختیار کرلی ۔ سید وقار الدین "رہنمائے دکن" کے موجودہ ایڈیٹر ہیں اور ان کے بڑے بھائی سید لطیف الدین مینجنگ ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔

رہبر دکن ۱۹۴۸ء سے قبل آزاد حیدر آباد کے تصور کا علمبردار اور سب سے بڑا "مجلس نواز" اخبار تھا۔ علاوہ ازیں اس کے مذہبی رویہ نے بھی اس اخبار کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ بعد کے حالات میں "رہنمائے دکن" ہندوستان کے نئے نقشہ میں اقلیتوں اور خصوصاً مسلم مفادات کا ترجمان بن گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ رہبر و رہنما کا مطالعہ حیدر آبادی صحافت کے انتہائی جذباتی اور حرکی دور سے آشنا کرتا ہے۔

حیدر آبادی صحافت کے آغاز سے لے کر ۱۹۱۸ء تک بلکہ اسٹیٹ کانگریس اور مجلس کے قیام تک اخبارات اصلاحی نقطۂ نظر کے مبلغ تھے۔ محب حسین کی وجہ سے تعلیمی تحریک چل پڑی تھی اور "صحیفہ" نے علمی فضا بنائے رکھنے میں موثر حصہ ادا کیا جب کہ مشیر دکن صحافتی قدروں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ان پُرسکون حالات میں شمالی ہند کی قومی تحریکوں نے حیدر آباد کی سیاسی زندگی میں ایک ہیجان برپا کیا پھر انقلاب سے روشناس کرایا۔ ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد اسٹیٹ ریفارمس اسوسی ایشن اور اسی سال اسٹیٹ کانگریس کمیٹی کے قیام اور اس کے بعد جب قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کی قیادت میں مجلس اتحاد المسلمین کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو ان گروہ بندیوں کا لازمی اثر صحافت پر پڑا۔ اور حیدر آباد کے اردو اخبار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ محب حسین نے جن قومی، اصلاحی اور سیاسی خیالات کو پھیلانے کی ابتدا کی تھی انھیں آگے چل کر اسٹیٹ کانگریس کے ہم نوا اخباروں "رعیت"، "پیام" اور "امروز" نے ایک منظم تحریک کے زیر اثر بڑھایا۔ اور ادھر قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور کی شہادت کے بعد قاسم رضوی کی جذباتی قیادت نے سارے ماحول میں آگ سی لگادی۔ ویسے بھی اس سے قبل ہی آریا سماجی اور آریا پرتی ندھی سبھا کی وجہ سے سیاسی مسائل زیر بحث آرہے تھے لیکن اب باضابطہ رسہ کشی شروع ہو چکی تھی اور ۱۹۴۷ء کو پہنچتے پہنچتے ریاستی سیاست ایک ایسے موڑ پر آپہنچی تھی جہاں ٹھہر کر مستقبل کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا تھا۔ "رہبر دکن" "رعیت" اور "پیام" نے صحافت میں سیاست کو علانیہ، موثر، اور معینہ طور پر پیش کیا۔ جب حکومتِ وقت

نے محسوس کیا کہ رعیت، قوم پرستانہ خیالات کو پھیلا رہا ہے تو اس پر احتساب عائد کیا گیا۔ یم نرسنگ راؤ نے جواباً اخبار ہی کو بند کر دیا۔ رعیت کے بند ہوتے ہی بی رام کشن راؤ، (جو بعد میں حیدرآباد کے چیف منسٹر بن گئے تھے) اور یم نرسنگ راؤ (جو بعد میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے) کی ایما پر شعیب اللہ خاں نے "امروز" جاری کیا۔ شعیب اللہ خاں کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ ادھر "پیام" پر بھی اختر حسن صاحب کے زمانہ ادارت میں حملے شروع ہوئے۔ دفتر پہنچ کر آگ لگا دی گئی۔ ان ہی ہنگاموں کے دوران میں کئی اور شاہ نواز مجلس نواز اور قوم پرست اخبار جاری ہو چکے تھے۔ نظام گزٹ ۱۹۲۷ء میں حبیب اللہ رشدی اور وقار احمد نے مل کر جاری کیا۔ صبح دکن کا اجرا احمد عارف اور علی اشرف کی وجہ سے ۱۹۲۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ دونوں اخباروں کے مدیران جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ "مجلس" حکیم غفران احمد انصاری کی ادارت میں جاری ہوا جو ۱۹۴۸ء تک برابر جاری رہا۔ "وقت" اور "منشور" عبدالرحمٰن رئیس کی ادارت میں ۱۹۲۹ء میں یکے بعد دیگرے جاری ہوئے۔ احمد اللہ قادری نے روزنامہ "سلطنت" ۱۹۳۰ء میں اور قاضی عبدالغفار نے ۱۹۳۵ء میں "پیام" جاری کیا۔ "میزان" غلام محمد اور حبیب اللہ اوج نے ۱۹۴۲ء میں "تنظیم" بھی اسی سال علی اشرف کی ادارت میں "اتحاد" عبدالقدس ہاشمی کی نگرانی میں ۱۹۴۷ء میں اور عظیم الدین محبت کا اخبار "مستقبل" اور "تعمیر دکن" فیض الدین کی ادارت میں جاری ہو چکا تھا، ان اخباروں کے علاوہ "انقلاب" (مرتضیٰ مجتہدی) "محمد و حسن" (لچھمی ریڈی)، "آواز" (احمد عبدالقادر) "جناح" (اظہر رضوی) ۱۹۴۷ء میں ہی جاری ہوئے تھے۔ "امروز" کے علاوہ "ہمدم" (مصطفیٰ قادری) "آغاز" (سید معین الحق) "منزل" (اظہر رضوی)، "اقدام" (مرتضیٰ مجتہدی) "نئی زندگی" (جے ین شرما) "شعیب" (انیس الرحمٰن) وغیرہ ۱۹۴۸ء کے ہنگامی حالات میں منظر عام پر آچکے تھے۔ ان اخباروں کے مدیران میں اکثر وہ تھے جو ریاست کی پہلی لیکن عالمی اہمیت کی حامل جامعہ عثمانیہ کے تربیت یافتہ تھے واقعہ تو یہ ہے کہ اس مادر علمیہ کے قابل فرزندوں نے اپنے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ

ریاست کی پس ماندہ عوام کو علم و ادب کے ذوق سے آشنا کیا اور سیاسی نقطہ نظر سے بھی اہم اور موثر رول ادا کیا ہے ۔ ان کے تاریخ ساز کارناموں کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔ ۱۹۳۵ء کے بعد کے ہنگامہ خیز حالات میں ۱۹۴۸ء تک حیدر آباد کی اردو صحافت کافی ولولہ انگیز رہی ہے ۔ اس دور میں تین مکاتیب خیال کے اخباروں نے اپنی واضح روش اختیار کی تھی ۔ "شاہ نواز" اخباروں میں "نظام گزٹ"، "صبح دکن" شمار کئے جاتے تھے نظام دکن کے فرمان ویسے تو سبھی اخباروں کو شائع کرنا پڑتا تھا لیکن ان اخباروں میں اندری باغ کے حوالے سے حضور نظام کے تحریرات شائع ہوتے تھے ۔ جو بعد کو ہر اخبار میں نقل ہوتے تھے ۔ ان اخباروں کے پیش نظر کنگ کوٹھی کا مفاد اور پرچم آصفی کا احترام رہا ہے ۔ "رہبر دکن"، "مجلس"، "اتحاد"، "جناح"، "آغاز"، مجلسی نقطۂ نظر کے علمبردار رہے ہیں اور ان اخباروں نے مسلم مفادات کے پیش نظر "نظام دکن" کو مسلمانوں کا مظہر تو قرار دیا لیکن انھوں نے آزاد حیدر آباد کے تصور کو عام کیا ہے ، جب کہ 'رعیت'، 'پیام'، 'وقت' اور 'امروز' ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے لئے کوشاں رہے ۔ 'پیام' نے ریاست میں ترقی پسندانہ افکار کو پھیلانے میں مدد دی ، اور کمیونسٹ تحریک کے لئے فضا ہموار ہوئی بالآخر ستمبر ۱۹۴۸ء میں ان ہی تحریکات کا نتیجہ شاہی کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوا ۔

"رہبر دکن" کے بعد وقار احمد نے اپنے دوست حبیب اللہ رشدی کے ساتھ "نظام گزٹ" جاری کیا ۔ اس اخبار میں نظام دکن کے تحریرات اور کلام شائع کیا جاتا تھا حبیب اللہ رشدی بعد کی نئی تبدیلیوں کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں مولانا اعجاز الحق قدوسی کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ سے منسلک ہو گئے اور یہاں وقار احمد نے اپنے انتقال ۱۹۵۹ء تک برابر نظام گزٹ کو جاری رکھا ۔ ان کے انتقال کے عبد الرحمن حلمی اور پھر وقار احمد کے فرزند فاروق احمد نے نظام گزٹ کو جاری رکھا لیکن مختصر سی مدت کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا ۱۹۴۸ء میں احمد عارف اور علی اشرف نے "صبح دکن" جاری کیا ۔ یہ بھی حضور نظام کا خاص اخبار سمجھا تھا ۔ احمد عارف اور علی اشرف ذہین صحافی تھے ۔ ان کی ذہانت اور اعتدال پسندی

کی وجہ سے "صبح دکن" بہت جلد عوام میں مقبول ہوگیا۔ اس اخبار سے معین الدین قریشی، اکبر وفا قانی اور شاہد صدیقی بھی وابستہ تھے۔ حکیم غفران احمد انصاری ہمیشہ ہی صحافت سے وابستہ رہے۔ انھوں نے کوئی (۱۷) اخباروں کو مختلف ناموں سے جاری کیا ہے۔ یہ حکومت پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کو اخبار یا رسالہ جاری کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ انھوں نے "مجلس"، "الاعظم"، اور چار مینار وغیرہ سید نور الحق نور جعفری کی ادارت میں جاری کرایا۔ نانديڑ گزٹ، چار مینار، دستر خوان اور بعض دیگر جرائد میں سیاسی حالات پر شائع ہونے والے طنزیہ اشعار انھیں کا نتیجۂ فکر ہیں کراچی سے ایک مزاحیہ ہفت روزہ "دستر خوان" جاری کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یم نرسنگ راو سیاسی آدمی پہلے تھے اور صحافی بعد کو بلکہ سیاسی نقطہ نظر کو عام کرنے ہی کے لئے انھوں نے ۱۹۲۸ء "رعیت" جاری کیا تھا۔ حکومت سرکار عالی کی طرف سے ۱۹۴۷ء میں جب اس پر احتساب عائد ہوا تو انھوں نے احتجاجاً "رعیت" بند کر دیا۔ عبد الرحمٰن رئیس نے ۱۹۲۹ء میں "منشور"، اور پھر "وقت" جاری کیا۔ "وقت" کو حکیم انصاری کی قلمی رفاقت حاصل رہی۔ رئیس پُرجوش صحافی اور صاحب طرز اہل قلم ہی نہیں آتش بیاں مقرر بھی تھے۔ اخباروں کی انجمن کے وہ صدر بھی منتخب ہوئے۔ انھیں حکیم انصاری، حبیب اللہ رشدی، عبد الصمد سراج الدین، حسام الدین غوری، عظیم الدین محبت، اکبر وفا قانی، مظفر الدین، ظفر اور بدر شکیب جیسے ذہین اور باذوق ساتھی مل گئے تھے۔ ان لوگوں کے تعاون عمل نے "منشور" اور "وقت" کو حیدرآباد کا مقبول اخبار بنایا۔ عبد الرحمٰن رئیس کا شمار بھی قوم پرستوں میں ہوا کرتا تھا۔ جب خلافت تحریک کا زمانہ آیا تو انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء میں ویوک وردھنی ہائی اسکول حیدرآباد میں بیرسٹر محمد اصغر کے زیر صدارت جلسہ عام ہوا اور ۱۹ر مارچ کو پورے شہر میں ہڑتال ہوئی۔ ان ساری سرگرمیوں کی تائید رئیس نے کی تھی۔ ان دنوں جن لوگوں پر حکومت کی مستقل نظر اور نگرانی تھی۔ ان ناموں میں امیر احمد سید ابراہیم، عبد السبحان، عطا حسن کے علاوہ رئیس کا نام بھی شامل تھا۔ سراج الحسن ترمذی

تو مجاہدین آزادی میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں سعد اللہ قادری نے "سلطنت" جاری کیا۔ اس نے بڑی حد تک سیاست سے خود کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ حیدر آباد کے ممتاز محقق شمس اللہ قادری کی سرپرستی بھی درپردہ اس کو حاصل تھی۔ اس اخبار میں بھی فرمان اور کلام دونوں بھی شامل ہوا کرتے تھے ۱۹۴۸ء کے بعد بھی اخبار جاری رہا۔ جب یہ بند ہوگیا تو "پیسہ" اخبار جاری کیا گیا۔ پیسہ اخبار اپنی نوعیت کا پہلا اخبار تھا جو حالی پیسہ ادا کرنے پر مل جاتا تھا۔ زیادہ دنوں تک یہ اخبار بھی جاری نہ رہ سکا۔ احمد اللہ قادری اس اخبار سے وابستہ تھے۔ حیدر آباد کے جن خاندانوں نے حیدر آباد کی علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں ان میں شمس اللہ قادری کا خاندان بھی قابل ذکر ہے۔

۱۹۳۵ء میں قاضی عبد الغفار نے "پیام" جاری کیا۔ پیام کی اشاعت کے ساتھ ہی صحافتی زبان بھی معیاری اردو سے زیادہ قریب ہو گئی۔ اور اس میں ادبی چاشنی بھی شامل ہو گئی۔ قاضی صاحب کے اداریئے بہت ہی بصیرت افروز ہوا کرتے تھے۔ نہ صرف حیدر آبادی اور ہندوستانی سیاست بلکہ عالمی سیاست کے تعلق سے بھی وہ قلم اٹھاتے تھے۔ جب قاضی صاحب ناظم اطلاعات ہوگئے تو انھوں نے اختر حسن صاحب کو "پیام" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اختر حسن صاحب ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں ان کا ادبی شستہ ذوق اور سنجیدگی نے "پیام" کی روایت کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

"میزان"، غلام احمد کی ملکیت تھا۔ اس کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج تھے۔ "میزان" بیک وقت اردو، انگریزی، اور تلنگی میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں میزان بند ہوگیا۔ یہ اخبار ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک برابر علم، ادب اور صحافت کی گراں قدر خدمات انجام دیتا رہا۔

علی اشرف نے ۱۹۴۴ء میں "تنظیم" جاری کیا۔ علی اشرف ابتدا میں روزنامہ "صبح دکن"

میں احمد عارف کے ساتھ کام کرتے رہے۔ تنظیم کے اداریہ سلامت روی کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔ چار سال کی اس مدت میں تنظیم کی اپنی آواز پیدا ہوگئی تھی۔ اور اس کے اپنے پڑھنے والے بھی تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبول رہا ہے۔

"اتحاد" ۱۹۴۷ء کے سیاسی انتشار کی پیداوار ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالقدوس ہاشمی اور سلطان بن عمر رہے ہیں۔ دراصل "اتحاد" مجلس کا ترجمان تھا۔ ابتدا میں مظہر علی کامل جو صدر مجلس تھے اس کے سرپرست بنے۔ اور بعد ازاں سید قاسم رضوی کی نگرانی میں آخر تک نکلتا رہا۔ ادارت کے فرائض ابتدا میں عبدالقدوس ہاشمی نے انجام دیئے۔ ان کا ایک ہفتہ وار "البلاغ" بھی نکلتا تھا۔ ہاشمی صاحب کے بعد سلطان بن عمر ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلیوں کے بعد ملٹری حکومت نے سید نورالحق نور، عبدالصمد سراج الدین حسام الدین غوری وغیرہ کے ساتھ ان کو بھی گرفتار کرلیا، رہائی کے بعد سلطان بن عمر نے مستقل طور پر بحرین میں سکونت اختیار کرلی ہے۔

"مستقبل" ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا اور ایک ہی سال میں ۱۹۴۸ء میں بند ہوگیا۔ عظیم الدین محبت سرکردہ صحافی تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں میں سے اچھے افسانہ نگار اور باذوق شاعر ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہوتے ہی اپنے چند قابل ہم جماعتوں کی معیت میں "مستقبل" جاری کیا۔ ابتدا میں ہفت روزہ تھا جسے بعد کو روزنامہ بنادیا گیا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد محبت بھی پاکستان منتقل ہوگئے اور انھوں نے وہاں سے "عوام" جاری کیا مگر یہ زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔

"جناح" ۱۹۴۷ء میں اظہر رضوی نے جاری کیا۔ نام ہی سے ظاہر ہے یہ مجلس نواز اخبار تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جب یہ اخبار بند ہوا تو اظہر رضوی نے منزل کے نام سے اخبار جاری کیا جو کچھ دنوں کے بعد بند ہوگیا۔

"امروز" قوم پرست اخبار تھا۔ شعیب اللہ خاں کو کانگریس پارٹی کی سرپرستی

حاصل تھی، ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنا اخبار جاری کیا۔ جب ان کا قتل ہو گیا تو یہ اخبار بھی بند ہوا۔ لیکن انیس الرحمٰن نے شعیب اللہ کی یاد کو باقی رکھنے اور ان کے مسلک کو آگے بڑھانے کی غرض سے "شعیب" جاری کیا جو کچھ ہی عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔

مجلس کی مخالفت کرنے والوں میں فیض الدین بھی شامل تھے۔ انھوں نے پولیس ایکشن سے پہلے اپنا روزنامہ "تعمیر دکن" جاری کیا تھا، جو ۱۹۴۸ء کے بعد بند کر دیا گیا۔ اپنی جرأت مندانہ صحافت کے لیے مشہور تھے۔ فیض الدین کا انتقال ۸ اگسٹ ۱۹۷۵ء کی صبح (۷۰) سال کی عمر میں ہوا۔

"انقلاب" ۱۹۴۷ء میں مرتضیٰ مجتہدی کی ادارت میں جاری ہوا۔ مرتضیٰ مجتہدی نظام آباد سے "رومان" ماہنامہ شائع کرتے تھے۔ پولیس ایکشن سے کچھ پہلے "انقلاب" جاری کیا۔ کم پڑھے لکھے تھے لیکن نزاعی مسائل میں بیک وقت مختلف نقاط نظر کو پیش کرنا اور اشتعال انگیز سرخیاں لگانا ان کا شعار تھا۔ رضاکار پریڈ میں انھوں نے مجلس کی مخالفت کی۔ اس وقت کے ذہنی انتشار کے زمانے میں اس سے فائدہ اٹھا کر اداریے اور خبریں شائع کیں۔ اس کی اشاعت کی تعداد ۱۲ تا ۱۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بعض مقدمات اور مالی پریشانی کی وجہ سے "انقلاب" بند کر دیا گیا۔ اس کا مالیہ مادھو راؤ انوری فراہم کرتے تھے ان سے الگ ہو کر مرتضیٰ مجتہدی نے ۱۹۴۸ء میں "اقدام" جاری کیا۔ اس میں سیاسی، ادبی جنسی اور فلمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار سے ترقی پسند صحافیوں کا ایک بڑا گروہ بھی وابستہ تھا جن میں احسن علی مرزا، وہاب حیدر، شاہد صدیقی اور زین العابدین شامل ہیں۔ شاہد صدیقی نے ایک عرصہ تک "اقدام" کے اداریہ لکھے ہیں۔ سلیمان اریب، نجمہ نکہت، برق موسوی، احمد غنی، امجد باغی، راج بہادر گوڑ، اور مخدوم بھی اس کے قلمی معاون رہے ہیں۔ مرتضیٰ مجتہدی نے مراسلت کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا کہ قاسم رضوی کو رہا کیا جانا چاہیے یا نہیں۔ ادبی مضامین پر انعام کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا ۱۹۵۲ء میں ملکی اور غیر ملکی کے احساسات کے نتیجہ میں جامعہ عثمانیہ کے طلبا نے ہڑتال کی اور اس میں

سبھی اسکولوں کے لڑکے بھی شامل ہوگئے تو سرکار کو فائرنگ بھی کرنی پڑی اور بہت سے معصوم بچے بھی اس فائرنگ کے نتیجے میں مارے گئے۔ اس موقعہ پر مرتضیٰ مجتہدی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اقدام کا ایڈیٹوریل بورڈ بنایا گیا جو عابد زین العابدین، اسد جعفری۔ اور اسمٰعیل ذبیح پر مشتمل تھا۔ بعد میں اس اخبار کے دو ایڈیشن عابد زین العابدین راور اسمٰعیل ذبیح کی ادارت میں جاری ہوئے۔ کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن بہت جلد اسمٰعیل ذبیح کا اقدام بند ہوگیا۔ عابد زین العابدین نے ہمارا اقدام جاری کیا۔ یہ دور حیدرآباد کی صحافتی تاریخ کا ہیجانی دور ہے۔ اس دور میں بہت سے اخبار وقفہ وقفہ سے جاری ہوتے اور جلد ہی بند ہوجاتے تھے۔ زین العابدین کی گرفتاری کے بعد "ہمارا اقدام" بند ہوگیا اور ان کے چھوٹے بھائی اسد جعفری نے "نیا زمانہ" جاری کیا اور مرتضیٰ مجتہدی کی بیگم سعادت جہاں رضوی نے "تازیانہ" ۱۹۵۰ء میں جاری کیا۔ مرتضیٰ مجتہدی نے "انگارہ" جاری کیا جس میں اسلم، وہاب حیدر، اور معین فاروقی شریک کار تھے۔ "انگارہ" بند ہوتے ہی معین فاروقی نے "انگارے" جاری کیا۔ "انگارے" آج بھی جاری ہے۔ اس اخبار سے ناظم مرزائی مستقلاً وابستہ ہیں۔ بمبئی کا انقلاب بھی ۱۹۵۲،۵۳ء میں فریدی کے زیر ادارت حیدرآباد سے بھی نکلتا تھا۔

"آفتاب دکن" کی اجرا سے لے کر "علم وعمل" کی اجرا تک کا یہ پہلا دور ابتدائی نوعیت کا ہے۔ ابھی صحافتی قدروں کا تعین ہوا تھا، نہ عوام میں اخبار بینی کا ذوق وشوق پیدا ہوا تھا۔ زبان اور لہجہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ فنی لحاظ سے بھی یہ فن نیا تھا۔ اس لئے اس ابتدائی دور کو فنی اور لسانی اہمیت حاصل ہے۔ اس دور کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ فنِ صحافت نے مستقل صورت اختیار کیا۔ صحافتی زبان ولہجہ کا تعین ہوا اور رفتہ رفتہ عام لوگوں میں اخبار بینی کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ علاوہ ازیں اس دور کے آخر میں "مشیر دکن" اور "علم وعمل" کی وجہ سے علمی، ادبی اور اصلاحی رجحان بھی پیدا ہوگیا۔ اس لحاظ سے اس دور کو ہم اصلاحی دور بھی قرار دے سکتے ہیں۔

۱۹۰۲ء کے بعد کے دور میں علم و عمل نے آگے بڑھ کر پورے سماج کا احاطہ کر لیا۔ علم و عمل کے علاوہ "صحیفہ" نے بھی صحافت کے اعلیٰ ذوق کو عام کیا۔ اس دور کے دوسرے اہم اخباروں میں "رہبر دکن"، "نظام گزٹ"، "صبح دکن"، "رعیت"، "منشور"، "تعمیر دکن"، "وقت"، "سلطنت"، "پیام"، "میزان"، "مستقبل"، اور "امروز" خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاسیس جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام کی وجہ سے ریاست کی ہمہ جہتی ترقی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تعلیم کے عام ہوتے ہی سماج کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں میں حسن اور نکھار پیدا ہو گیا۔ جامد زندگی کی بجائے حرکت و عمل نے لے لی۔ علم کا ذوق بڑھتا گیا، کتابیں، رسائل اور اخباروں کو فروغ حاصل ہوا۔
کہنے کو تو جامعہ عثمانیہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی یادگار ہے، لیکن ابتدا ہی سے اس کا کردار جمہوری اور سیکولر رہا ہے۔ اس کے ثبوت میں حیدر آباد کی صحافت کو پیش کیا جا سکتا ہے اس دوسرے دور میں جامعہ عثمانیہ کے جن سپوتوں نے صحافتی زندگی میں قدم رکھا انھوں نے مختلف انداز سے عوام کی رہبری کی اور ہر صحافی اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں آزاد تھا۔ ان صحافیوں میں جنھوں نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم حاصل کی اور جن کی ذہنی تربیت جامعہ ہی کے ماحول میں ہوئی ان میں حبیب اللہ رشدی، وقار احمد، عبدالرحمٰن رئیس، حبیب اللہ اوج جلال الدین اشک، سلطان بن عمر، عظیم الدین محبت، اکبر وفاقانی۔ بدر شکیب، مکیش حیدر آباد، نظر حیدر آبادی، ابراہیم جلیس، میر حسن، مخدوم محی الدین، اختر حسن، حسینی شاہد زینت ساجدہ، حمید الدین شاہد، عبدالقدوس ہاشمی، یوسف امجد زئی۔ سردار الہام، اور سید معین الحق وغیرہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان ناموں سے خود ظاہر ہے کہ ان میں بعض صحافی "شاہ پسند" رہے ہیں اور بعض "مجلس نواز"، بعض ترقی پسند ہیں۔ اور بعض قوم پرست لیکن ان میں سے بیشتر کی ذہنی تربیت مادر علمیہ جامعہ عثمانیہ ہی میں ہوئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا یہ سیکولر اور جمہوری کردار ایک ایسے بادشاہ کا مرہون منت ہے جو مطلق العنان تھا واقعہ تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان زمانہ شناس آدمی تھے انھوں نے زمانہ کے بدلتے ہوئے تیور کو محسوس کیا اور دیکھا کہ دنیا میں جو عوامی انقلابات آرہے ہیں

وہ انسانی نقطہ نظر سے زیادہ مفید اور سودمند ہیں اور ان انقلابات کا لازمی اثر حیدر آباد پر بھی پڑے گا۔ چنانچہ ان انقلابات کا اثر خود انھوں نے بھی قبول کیا۔ اور عوام کی بھلائی کے کاموں میں وہ مصروف ہو گئے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ دارالترجمہ، کتب خانہ آصفیہ کا قیام اور دیگر بہت سے فلاحی و علمی کاموں کا آغاز خود اعلیٰ حضرت مرحوم کی عدل گستری اور علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ہمیں ماضی کی اچھائیوں کے اعتراف میں کبھی بخالت سے کام نہیں لینا چاہیے خصوصاً تاریخ صحافت میں جامعہ عثمانیہ کا جو رول رہا ہے وہ ہر طرح قابل تحسین ہے۔

سیاست اور صحافت کے اس ہیجان انگیز دور میں بہت سے اخبار جاری ہوئے اور دار و رسن کی آزمائشوں سے گذرے ہیں، یہ آزمائشیں اپنی نوعیت کی پہلی تھیں۔ اسی دور میں ایک صحافی کا قتل بھی ہوا۔ جوش و خروش پیدا ہوا، نعرے بلند ہوئے۔ تحریکیں چل پڑیں اور سیاسی اور سماجی قدروں کی شکست و ریخت کا بھی یہی دور ہے۔ مختلف اخباروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کو زور و شور سے پیش کیا۔ آپسی رقابتیں بڑھ گئیں۔ لیکن اردو تہذیب کا یہ خاصہ رہا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود شخصی اور انفرادی طور پر یہ سب صحافی دوست تھے، ایک دوسرے کا احترام جانتے تھے۔ رواداری میں فرق آنے نہ پایا۔ یہی رواداری اخلاص اور دوستی آج بھی باقی ہے۔ بہت سے صحافیوں نے ۱۹۴۸ء کی تبدیلیوں کے بعد ترک وطن کیا اور پاکستان منتقل ہو گئے ایسے صحافیوں میں عبدالرحمٰن رئیس، حبیب اللہ رشدی، غلام احمد، حبیب اللہ اوج، سلطان بن عمر، عظیم الدین محبت، اشک، اکبر وفاقانی، بدر شکیب، نظر حیدر آبادی، فصیح الدین پرچم، ابراہیم جلیس، حکیم انصاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان صحافیوں میں سے اکثر نے پاکستان میں بھی صحافت سے اپنی وابستگی کو برقرار و باقی رکھا۔ جن لوگوں نے حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ کے نام کو روشن کیا، ان میں ابراہیم جلیس کا نام یقیناً ممتاز ہے۔ ابراہیم جلیس دم واپسیں تک صحافت کو انسانیت کی خدمت کا وسیلہ بنائے رکھا۔ اور بالآخر ذوالفقار علی بھٹو کے زوال اور ضیا الحق کے عنان حکومت سنبھالنے تک یہ برابر عوامی تحریک سے وابستہ رہے۔ یہاں تک کہ

مشکوک حالات میں ان کی موت واقع ہوئی۔ جس سے صحافتی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔

۱۹۴۸ء میں جب نظام دکن کی حکومت ختم ہوگئی اور وہ شاہ سے راج پرمکھ بن گئے تھے حیدرآباد کی مطلق العنانی ختم ہوگئی اور حیدرآباد ایک بڑے اور آزاد، خود مختار، سیکولر اور جمہوری ملک کا جزو بن گیا۔ جن صحافیوں نے ان نئے حالات سے خود کو مطابق نہیں کیا یا جو نہیں کرسکتے تھے وہ تو ترک مقام کر گئے لیکن جو یہاں تھے وہ بھی انتشار ذہنی کا شکار تھے۔ ایسے ہی انتشار، رواداری، اور خوف کے زمانہ میں "آغاز" جاری ہوا۔ سید معین الحق اس کے مدیر تھے۔ اور اس اخبار سے نور المرتضیٰ سہروردی، عبدالمجید صدیقی، محمد عیسیٰ، حفیظ اللہ افسر اور عبداللہ خاں وابستہ تھے۔ اس اخبار نے عوام کو نیا سہارا دینے کی کوشش کی لیکن بہت جلد بند ہوگیا۔ "پولیس ایکشن" کے فوری بعد جے ہند پبلیکیشنز نے پانچ اخبار جاری کئے۔ "نئی زندگی" اردو روزنامہ تھا۔ جو جے ین شرما کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اور اس اخبار سے امجد یوسف زئی، احسن علی مرزا، وحید یوسف زئی اور سردار الہام وابستہ تھے۔ "نیو لائف" انگریزی روزنامہ ولشم، پائن کی ادارت میں نکلتا تھا جس سے دیوی سنگھ چوہان بھی وابستہ تھے۔ "فریڈم" انگریزی ہفتہ وار تھا اس کے ایڈیٹر گویندا اس صراف تھے۔ اور "سادھنا (کنڑی ہفتہ وار) جاگیردار ایڈیٹر اور "مرہٹواڑہ" (سہ روزہ مرہٹی اخبار) واگ مارے کی ادارت میں نکلتے رہے۔ ان اخباروں کی پالیسی قومی تھی اور تقریباً دو سال تک یہ اخبار جاری رہے۔ ۱۹۴۸ء کے فوری بعد کے اخبار ذہنی انتشار اور بے چینی کی غمازی کرتے رہیں۔ ان میں سے بیشتر نے اس انتشار کو ختم کرنے کی سعی وکوشش کی ہے۔ جن اخباروں نے نئے حالات سے مطابقت پیدا کی اور عوام کو نئے سہارے دیئے ہیں ان اخباروں میں "سیاست" کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے اور یہی اخبار آج کے بدلے ہوئے جدید دور کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

۱۹۴۸ء کے بعد یوں تو بہت سے اخبار جاری ہوئے۔ مثلاً "اقدام" (مرتضیٰ مجتہدی) "نئی زندگی" (جے ین شرما)، "ہمدرد" (نقش عالمی)، "ہمدم" (جمال الدین اور مصطفےٰ قادری)

"تازیانہ" (سعادت جہاں) "ہمارا اقدام" (عابد زین العابدین) "ہمارا اقدام" (شہریار) "نیا زمانہ" (اسد جعفری) "سلطنت" (سعد اللہ قادری) "بیسہ اخبار" (احمد اللہ قادری) "انگارے" (معین فاروقی) "وطن" (راشد بیگ) "امر بھارت" (شاکر پورن چند) "صداقت" (وحید الحسن) "ذبیح" (اسمٰعیل ذبیح) "حق" (شیخ چاند) "نوید دکن" (عظیم عسکری) "منصف" (محمود انصاری) اور "خون ناب" (جی ایم عروج) ان میں سے بیشتر اخباروں نے یا تو سنسنی خیزی کو وطیرہ بنالیا، یا اس میں سے اکثر نے عہد طفلی میں دم توڑ دیا۔ ان کا کوئی اثر تھا بھی تو وہ بڑا محدود تھا اور وقتی بھی۔ اس لئے فوری زائل ہو گیا۔ لیکن جن اخباروں نے بعد کے ان حالات میں جو گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں اور جنھوں نے فکر و عمل کی نئی راہوں کو استوار کیا، جنھوں نے یاس کو آس سے بدل دیا اور بے چارگی کے احساس کو ختم کرنے میں پہل کی ہے اور جنھوں نے اعتدال پسندی، میانہ روی، آزاد روش اور جمہوری انداز فکر کے ذریعہ نیا اور قومی ماحول پیدا کیا اور جنھوں نے قدامت پرستی کی بجائے ترقی پسندی کو اپنایا ان اخباروں میں روزنامہ "پیام" اور "سیاست" نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

"ملاپ" یدھ ویر جی کی ادارت میں ۱۹۴۸ء ہی سے نکلنے لگا تھا۔ ابتدائی زمانہ میں چونکہ آریا سماجی ذہنیت اور مہاسبھائی خیالات کو نمایاں پبلسٹی ملتی رہی اور کچھ اس کی قوم پرستانہ روش نے بھی اس کو قدامت پسند مسلمانوں میں بڑی حد تک مشکوک بنا دیا تھا لیکن ملاپ نے کبھی بھی فرقہ پرستی کی تائید نہیں کی ہے۔ یہ اخبار دلی اور جالندھر سے بھی شائع ہوتا ہے اور اس کے چیف ایڈیٹر رنبیر جی ہیں۔ آج کل اس کا ہفتہ وار ایڈیشن لندن سے بھی جاری ہوا ہے

"رہنمائے دکن" کا میلان چونکہ مسلم مفادات کی طرف زیادہ رہا ہے اس لئے اس اخبار پر بھی جانبداری کا الزام رہا ہے، لیکن یہ اخبار ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات میں اس بات کا کوشاں رہا ہے کہ اقلیتوں کو ان کا جائز مقام ملے۔ اس دور میں "پیام" ہی ایسا اخبار تھا

جو اپنی ماضی کی رواداری، غیر جانب داری اور اعتدال پسندی کو نبھائے جا رہا تھا۔ چونکہ اس اخبار کا میلان کمیونزم کی طرف زیادہ تھا اس لئے مسلمان اور ہندو دونوں ہی کے نزدیک یہ معتوب رہا۔ لیکن اس اخبار کو روشن خیال اور ترقی پسند افراد نے ہمیشہ ہی اہمیت دی ہے۔ اختر حسن صاحب کی سیاست میں عملی دلچسپی کے نتیجہ میں اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر "پیام" بہت جلد رو بہ زوال ہوگیا۔ اس نازک دور میں اس کا نعم البدل ضروری تھا اور ان ہی حالات میں عابد علی خاں صاحب اور ان کے رفیق کار محبوب حسین صاحب جگر نے ۱۵ اگسٹ ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "سیاست" جاری کیا۔

حال حال میں جو روزنامے شائع ہوئے ہیں ان میں "نوید دکن" اور "منصف" کو اہمیت حاصل ہے۔ "منصف" جواں سال صحافی محمود انصاری کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ محمود انصاری سنجیدہ اور خاموش نوجوان ہیں۔ "منصف" ان کی میلان طبع کا آئینہ دار ہے۔

ہندوستانی اخباروں میں بیرونی ملکوں سے متعلقہ خبروں کی اشاعت ایک حد تک مایوس کن ہے۔ غیر ملکوں میں ہمارے اخباروں کے نامہ نگاروں کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں ہے اور ہمارے اخبار بیرونی ملکوں کی خبروں کے لئے "اے، پی، اے رائٹر"، "اے ایف پی"، "ڈی اے" اور "یو ین آئی" پر تکیہ کرنے پر مجبور ہیں۔ حکومت ہند نے اپنی پالیسی کے تحت بیرونی ایجنسیوں کی طرف سے ہندوستانی خریداروں کو خبروں کی راست فراہمی کی ممانعت کر دی ہے۔ اس لئے ان تمام خبروں کے لئے ان خبر رساں اداروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاہم ان دشواریوں کے باوجود ہندوستانی اخباروں نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ یہ ترقی ماضی کی روشنی میں غیر معمولی ہے۔ لیکن اس کا ایک مایوس کن بھی ہے۔ اگر ہم بیرونی ملک کے اخباروں کا جائزہ لیں تو ہمارے اخباروں کی یہ ترقی برائے نام معلوم ہوتی ہے۔ جدّت طرازی یا ٹکنالوجیکل ترقیات کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ یا جاپان کے اخباروں کے مقابلے میں ہماری صحافت بہت پیچھے ہے۔ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" جناب عابد علی خاں نے اپنے دورۂ امریکہ میں

یقیناً اس تفاوت کو محسوس کیا ہوگا۔ شائد اسی لئے وہ ہر مرتبہ اس بات کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ ممکن طور پر "سیاست" کو جدید تر بنائیں۔

لتھو سے آفسٹ کی جانب حیدرآباد کے اردو اخباروں کا یہ سفر ترقی کے نئے امکانات کو روشن کرتا ہے، امید افزا بات یہ ہے کہ اب روزنامہ "سیاست" نے ایک اور قدم ترقی کی طرف بڑھایا ہے۔ روٹری مشین کی تنصیب صرف پریس اور پرنٹ کی ہی نہیں ذہن و قلب کی بھی ترقی کی ضامن ثابت ہوگی۔ صاف، ستھری چھپوائی، آنکھوں کو چمک اور ذہن و قلب کو روشنی عطا کرتی ہے۔ اس روشنی میں زندگی کی سچی اور اچھی راہیں اجاگر ہوتی ہیں۔ سیدھے اور سچے راستہ کی طرف ہمارے قدم تیزی سے بڑھیں گے ہمارے یہ بڑھتے ہوئے تیز قدم انسانیت و شرافت اور تہذیب و تمدن کی نئی منزلوں سے آشنا ہوں گے۔ بالآخر ہم اس دنیا میں پہنچ جائیں گے جو ابن آدم کے خوابوں کی دنیا ہے۔ سچائی، نیکی، عزت، شرافت، امن، سلامتی، مساوات، اخوت، آزادی اور انصاف کی دنیا ہے جو صرف اور صرف انسانوں کی دنیا ہے۔ نیک خو، نیک دل اور خوش حال انسانوں کی دنیا — اور وہ دنیا اب بہت دور نہیں ہے۔

ہزار داستان

مدت دراز تک "ہزار داستان" کو اور کبھی شوکت الاسلام کو دکن سے شائع ہونے والا پہلا روزنامہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ سید انوار الحق جعفری نے اپنے مضمون "دکن میں مسلم مفادات کے حامی اردو روزنامے" میں لکھا ہے۔[۵]

"خورشید دکن" حیدر آباد کا پہلا اخبار ضرور تھا۔ لیکن پہلے روزنامہ کی حیثیت "ہزار داستان" کو حاصل ہے جو ۱۸۸۳ء میں محمد سلطان عاقل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا اور پانچ سال تک شائع ہوتا رہا"۔

انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ آخر یہ اولیت اور اہمیت "ہزار داستان" کو حاصل کیوں ہے؟۔ جب کہ خورشید دکن مرزا کاظم غازی کی ادارت میں "ہزار داستان" کے اجرا سے قبل ۱۸۷۷ء ہی میں جاری ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے سجن لال صاحب نے اپنی کتاب "Vistas of modren Indian History" میں "آفتاب دکن" کو حیدر آباد کا پہلا روزنامہ قرار دیا ہے جو قاضی محمد قطب نے ۱۸۶۰ء میں جاری کیا تھا۔

بلاشبہ "ہزار داستان" حیدر آباد کا پہلا روزنامہ نہیں ہے لیکن اس سے اخبار کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ حیدر آباد کی سماجی، ادبی، اور تہذیبی دنیا میں پانچ سال

۵۔ برگ گل ص ۲۹۶، کراچی

تک اپنا اثر ڈالتا رہا۔ اس کا اس بات سے ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت کی حکومت کی طرف سے اس اخبار کو سالانہ ڈیڑھ ہزار روپے کی امداد دی جاتی تھی۔ حکومت نظام اس ادارہ سے شائع ہونے والے ایک اور اخبار "پیک آصفی" کو بھی سالانہ ڈیڑھ ہزار روپے گرانٹ دیا کرتی تھی۔ "پیک آصفی" جنوری ۱۸۸۴ء سے منشی سید حسن جشن بلگرامی کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔

سلطان محمد عاقل کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتے، سید انوار الحق نے انھیں دہلوی لکھا ہے۔ ممکن ہو حیدر آباد کی پر امن فضا اور خوشحالی نے دیگر ہزاروں افراد کی طرح انھیں بھی دلّی سے دکن کھینچ لائی ہو۔ ابتدا میں انھوں نے "ہزار داستان" کو ہفتہ وار جاری کیا لیکن بعد کو یہ روز نامہ ہو گیا۔ غالباً یہ ۱۸۸۹ء میں بند ہو گیا۔

[اس اخبار سے اردو کے ترقی پسند شاعر شاہد صدیقی بھی وابستہ تھے۔ شاید شاہد صدیقی کی صحافتی زندگی کا نقطۂ آغاز یہی اخبار ہے۔ شاہد صدیقی اپنی آخری سانس تک حیدر آباد کی اردو صحافت سے وابستہ رہے۔ انھوں نے "الاعظم"، "مشیر دکن"، "نظام گزٹ"، "صبح دکن"، "پیام"، "ملاپ" اور آخری زمانہ میں روزنامہ "سیاست" سے منسلک تھے۔ اس حیثیت سے ہم "شاہد صدیقی" کو "ہزار داستان" کی دین بھی سمجھ سکتے ہیں۔]

مشیر دکن

روزنامہ مشیر دکن اپنی قدامت اور روایت کے اعتبار سے عہد آصفیہ کی زندہ یادگار ہے۔ ابتداً یہ ۱۸۹۲ء میں ہفتہ روزہ تھا لیکن ۲۲؍اپریل ۱۸۹۷ء میں کشن راؤ آنجہانی نے مشیر دکن کو روزانہ شائع کرنا شروع کیا۔ تاریخ اردو صحافت میں اس کو یہ بھی اہمیت حاصل ہے کہ ۱۸۹۲ء سے لے کر آج تک جاری ہے۔ اشاعت کا یہ طویل زمانہ کسی بھی زبان کی تاریخ صحافت میں اپنی مثال آپ ہے اور یہ حیدر آباد کی تاریخ میں بجائے خود بڑا کارنامہ ہے۔ اگر ہم حیدر آباد کی سیاسی، ادبی، تہذیبی اور صحافتی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ضروری نہیں کہ "آفتاب دکن" (۱۸۷۷ء) سے اس کا آغاز کریں۔ کیونکہ ۱۸۷۷ء تا ۱۸۹۲ء کا یہ درمیانی وقفہ ہماری صحافت کا نقطۂ آغاز ہے اور اس ابتدائی دور میں ہم صرف صحافت کے اصول اور زبان کے اختراع میں مصروف رہے اس لئے "مشیر دکن" کا مطالعہ حیدر آباد کی صحافتی، ادبی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ صحافتی نقطۂ نظر سے تو مشیر دکن تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ جن جن صحافیوں نے کام کیا انھوں نے انفرادی طور پر صحافت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہیں۔

سردار علی (ایڈیٹر تجلی)، مجیب احمد تمنائی (ایڈیٹر سحر البیان) وقار احمد (ایڈیٹر نظام گزٹ) میر حسن، احسن علی مرزا وغیرہ کے نام اس خصوص میں کافی اہمیت رکھتے ہیں

ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے صحافی تھے جنھوں نے کشن راؤ سے استفادہ کیا۔

ابتدا میں کشن راؤ نے "دکن پنچ" کے نام سے فروری ۱۸۸۷ء میں ہفتہ وار رسالہ جاری کیا۔ جس میں مزاحیہ مضامین اور کارٹون شامل ہوا کرتے تھے۔ بعد کو اسے ماہنامہ کر دیا گیا۔ اور "مشیر دکن" کے نام سے مارچ ۱۸۹۲ء میں ہفتہ وار جاری کیا۔ جو ۲۲ر اپریل ۱۸۹۷ء سے روزانہ شائع ہونے لگا۔ ۱۸۹۰ء میں اخبار کو بند کرنا پڑا اور کشن راؤ کو جب شہر بدر کیا گیا تو کچھ مدت تک یہ اخبار مدراس سے نکلتا رہا۔ اور غالباً ۱۸۹۹ء سے دوبارہ حیدر آباد سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں کشن راؤ کے انتقال کے بعد "مشیر دکن" ان کے صاحبزادے واسدیو راؤ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ واسدیو جی کا انتقال ۱۰ر نومبر ۱۹۷۳ء کو بعمر ۷۲ سال دواخانہ عثمانیہ میں ہوا۔ مسٹر وسنت راد اب اس اخبار کو چلا رہے ہیں۔ واسدیو راؤ انتہائی خاموش، منکسر المزاج اور مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا "مشیر دکن" کا مطالعہ تاریخ و ادب کا مطالعہ ہے اور اس مطالعہ کے دوران میں آپ ان تمام تبدیلیوں اور انقلابات سے آشنا ہوتے جائیں گے جو پچھلی پون صدی میں آتے رہے ہیں۔ اور جن تبدیلیوں اور انقلابوں کے ذریعہ حیدر آباد کی نئی شکل بنی ڈھلی ہے، جس زمانہ میں "مشیر دکن" جاری ہوا۔ وہ سیاسی اعتبار سے پُر امن دور تھا اور اس زمانہ میں کسی سیاسی انقلاب کی بات تو دور کی ہوئی کسی تبدیلی کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ عوام آصفی پرچم کا ہر طرح احترام کرتے تھے اور بادشاہ تو ان کا ظل سبحانی تھا۔ آصفی بادشاہوں کا بالکل اثر و اعتماد بحال تھا، حد تو یہ کہ آصف جاہ سابع کے دور میں بھی بادشاہ کی طرف انگلی اٹھانا گویا تعزیری جرم سمجھا جاتا تھا۔ "مشیر دکن" کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں کسی بھی سیاسی خبر کو کوئی خاص مقام نہیں دیا جاتا تھا۔ البتہ ادبی، معاشرتی اور مذہبی خبروں کو نمایاں مقام دیا جاتا تھا۔ اور رعایا کے اخلاق کو سدھارنے کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ چنانچہ

ذیل کے اقتباس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے :

"نہایت مبارک ہے وہ گورنمنٹ کہ جس کے کارپرداز لوگ راست بازی اور دیانت داری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہیں اور بدقسمت ہے وہ گورنمنٹ کہ جس کے اعمال بددیانتی اور دغا بازی سے کام کرتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس ملازم سرکار میں راست بازی اور دیانت کا مادہ نہیں ہوگا اس سے وفاداری اور خیر خواہی کی امید بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ دیانت داری اور راست بازی گویا علامت ہے خیر خواہی اور وفاداری کی۔"

(مشیر دکن ۹ر جولائی ۱۸۹۶ء)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کشن راؤ آنجہانی نے ایک صاف ستھرے اور دیانت دار و خیر خواہ انتظامیہ کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس تقریباً پون صدی قدیم اردو کا نمونہ بھی ہے۔ زبان و بیان قدرے پرانی ہونے کے باوجود جدید زبان و اسلوب سے بہت زیادہ قریب ہے۔ سادگی، سلاست اور اظہار رائے کا واضح انداز اس وقت کی اردو سے بہتر ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی تھی۔ سر سید اور ان کے اخبار تہذیب الاخلاق کی زبان بڑی حد تک فارسی آمیز اور ادق تھی اور بیان بھی پیچیدہ ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے حیدر آباد سے نکلنے والے اخباروں کی زبان زیادہ سہل اور عام فہم تھی۔ زبان و بیان کی اس سادگی نے "مشیر دکن" کو دکن کا مقبول عام اخبار بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ میں کشن راؤ آنجہانی کے علاوہ ان کے احباب اور کارکن صحافیوں، سردار علی، مجیب احمد تمنائی، عبد المجید (نامہ نگار) شیخ محمد، وقار احمد، میر حسن، احسن علی مرزا وغیرہ کا بھی اہم اور نمایاں حصہ ہے۔ ان لوگوں نے مل کر حیدر آبادی صحافت کو نطق بھی اور انداز بیان ادا کیا ہے۔ صحافتی قدروں کی اختراع کی ہے اور ایک خاص لہجہ کا بھی تعین کیا ہے۔

"مشیر دکن" کے روح رواں، سردار علی تھے۔ جن کی ایک کتاب "اردو کے انگریز شاعر"

شائع ہوکر مقبول ہوئی۔ فارسی اور اردو کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ اخباری زبان پر بہت حاوی تھے۔ اور ترجمہ بھی بہت اچھا کر لیتے تھے۔ مقامی خبروں کی اشاعت میں سردار علی مصلحت اندیشی کا کمال دکھاتے تھے۔ انھوں نے کسی بھی مقامی خبر کو کبھی مسترد نہیں کیا اور بقول میر حسن صاحب، ہر ایک خبر ان کی صلح کل طبیعت کے سانچے میں بآسانی ڈھل جاتی تھی اس لئے کبھی "مشیر دکن" سے کوئی نزاع یا کسی فریق کو شکایت نہیں تھی۔ سردار علی نے اپنا ایک ماہنامہ "تجلّی" بھی جاری کیا تھا جو ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکا تھا۔ وہ ادب کا بھی خاصہ ذوق رکھتے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسے باکمال صحافی مدتوں بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔

"مشیر دکن" سے بھجنگ راؤ اور میر حسن صاحب وابستہ تھے۔ میر حسن ترجمہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چند مہینوں کی مشق نے انھیں اس فن میں باکمال بنادیا چنانچہ دو کالم کا ترجمہ ایک گھنٹہ سے بھی کم وقت میں کر دیا کرتے جیسے عام طور پر دو گھنٹوں کا وقت درکار ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ان کی شام۔ مخدوم، نور الہدیٰ، ظفر الحسن وغیرہ کے ساتھ گذرتی تھی۔ اور بسا اوقات مخدوم یا نور الہدیٰ دفتر آکر سر ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ اگر میر حسن صاحب کسی وجہ سے دفتر نہ جا سکتے تو مخدوم ان کی جگہ دفتر پہنچ جاتے اور ان کا کام کر دیتے۔ اس زمانے میں شیخ محمد صاحب کے تراجم بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ "مشیر دکن" کی اشاعت اس زمانہ میں خاصی وسیع تھی۔ ہندو مسلم سبھوں میں یہ روزنامہ مقبول تھا۔ اکثر بڑی عمر کے لوگوں کو "مشیر دکن" کے مطالعے کی عادت پڑ گئی تھی۔ "مشیر دکن" میں کسی واقعہ کا شائع ہوجانا اس کے صحت پر مبنی ہونے کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں طاعون حیدر آباد میں تقریباً ہر سال آیا کرتا تھا میر حسن صاحب نے اپنے محلہ بی بی کے الاوہ کے بارے میں بتایا کہ لوگ جب کبھی "مشیر دکن" میں طاعونی چوہوں کی خبر چھپتی تو گھر وار چھوڑ کر دیہات چلے جاتے اور اس وقت تک نہیں آتے تھے جب تک "مشیر دکن" میں یہ خبر نہ چھپے کہ بفضلِ خدا طاعون کا پوری طرح دفیعہ ہو چکا ہے۔

"مشیرِ دکن" کے اداریئے واسدیو راؤ صاحب کی مرنجان مرنج اور بے غرض رواداری پالیسی کی وجہ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن لوگ ان کو پڑھتے ضرور تھے۔ اور کبھی کبھی ایڈیٹر کے نام خطوط بھی اداریئے سے متعلق وصول ہوتے تھے۔ حیدرآباد میں اس زمانہ میں تجارت کا کاروبار محدود پیمانے پر ہوتا تھا اس لئے "مشیرِ دکن" اور اس کے ہم عصر روزنامے "صحیفہ" اور "رہبرِ دکن" کو کچھ زیادہ اشتہارات نہیں ملتے تھے۔

"مشیرِ دکن" کو سردار علی کے بعد جس صحافی نے اپنا خونِ جگر دیا وہ مجیب احمد تمنائی تھے۔ وہ اس کے خاص قلمی معاون تھے۔ چنانچہ واسدیو راؤ تمنائی صاحب کی ذہانت، محنت اور قابلیت کے قائل ہیں۔ تمنائی اپنے زمانہ کے مشہور ادیب، فن کار، اور صحافی تھے ان کی مقبولیت صرف دکن تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ حیدرآباد کے رسائل کے علاوہ الہ آباد ریویو، آزاد لکھنو، وقت گورکھپور، صدائے ہند لاہور، تصویرِ عالم، کانپور اور وفادار زیادہ تر ان کی تخلیقات کے مرقع تھے۔ "مشیرِ دکن" کے موسس آنجہانی کشن راؤ اور مجیب احمد تمنائی میں قریبی دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ بے انتہا انس و محبت اور بھائی چارگی بھی موجود تھی۔ اس طرح "مشیرِ دکن" ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار بھی تھا اور نمائندہ بھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دکن میں سیاسی تحریکات کے آغاز تک بھی ایسا کوئی فرق جو فرقہ وارانہ نوعیت کا ہوتا ہے موجود نہ تھا۔ بلکہ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہا کرتے تھے۔ چنانچہ "مشیرِ دکن" کے موسس ایک ہندو اور ان کے سبھی معاون مسلمان تھے۔ اور یہی بات ثبوت کے لئے کافی ہے۔ برسہا برس کے بیت جانے اور حیدرآبادی زندگی میں سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر شدید نوعیت کی تبدیلیاں آنے کے باوجود آج بھی "مشیرِ دکن" نے اپنی صلح کل پالیسی کو باقی اور برقرار رکھا ہے۔

علم و عمل

محب حسین[۱] حیدر آبادی اردو صحافت کے باوا آدم ہیں۔ ان معنوں میں کہ انھوں نے سب سے پہلے اردو صحافت کو ایک فن بنایا۔ صحافت کو نطق و آہنگ دیا۔ صحافت کا مزاج بنا۔ روایت بنی، نیا شعور دیا اور ان ہی کی کوششوں سے حیدر آبادی صحافت کی تاریخ نے ایک نیا موڑ بھی لیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک حیدر آبادی عوام بھی اور حیدر آبادی صحافت حیدر آباد سے باہر کے سیاسی لیل و نہار سے نا آشنا تھے اور بادشاہ سلامت کی تا ابد زندگی کے لیئے دُعا مانگ رہے تھے۔ تہذیبی اور تمدنی ترقی اپنے نشہ میں چور تھی۔ تعلیم کا یہ عالم کہ اب تک بھی اتنی بڑی اور قدیم ریاست میں کوئی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی۔ پرانی قدریں اور زندگی گذارنے کا مغلائی انداز تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ حیدر آبادی تہذیب میں عام تھا۔ اس عالم بے خبری میں "علم و عمل" کی اجرائی (سنہ ۱۹۰۲ء) عمل میں آئی۔ اس کے پہلے مدیر صادق حسین تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں محب حسین "علم و عمل" سے وابستہ ہو گئے اور اس روزنامہ کو انھوں نے "اسم بامسمّٰی" بنا دیا۔ علم کی اہمیت کو جتلایا اور لوگوں کو عمل کی ترغیب دی۔ یہی بڑا کارنامہ اس روزنامہ کا ہے۔

---

[۱] تفصیلی حالات زندگی کے لیئے دیکھئے "یاران شہر"

ڈیمی سائز کے اس اخبار کے پہلے نصف صفحہ پر دو حاشیوں کے درمیان چار مینار کی تصویر ہوتی تھی اور پیشانی پر جلی حروف میں "علم و عمل" لکھا ہوتا۔ نصف صفحہ پر چار مینار کی تصویر کے نیچے اخبار کا جلد نمبر، تاریخ اور شمارہ نمبر درج ہوا کرتا تھا۔ اور اس کے نیچے اخبار کے مندرجات مثلاً "تازہ تار برقیاں، (۲) ترجمہ اخبارات انگریزی اور اردو کی منتخب خبریں (۳) ایڈیٹوریل (۴) اصلاح و تردید (۵) نظم (۶) سوانح عمریاں، (۷) اخلاق و ادب (۸) کتابوں اور رسالوں پر ریویو (۹) علوم و فنون (۱۰) انتخاب مضامین اخبارات (۱۱) صنعت و حرفت (۱۲) زراعت (۱۳) تجارت (۱۴) لوکل (۱۵) مراسلات (۱۶) چھوٹی چھوٹی ناولیں اور (۱۷) اشتہارات۔ ان موضوعات کے دیکھنے کے بعد بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "علم و عمل" کی وجہ سے ہمارے اخبارات ہماری زندگی کے تقریباً سبھی شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اور ان ہی موضوعات کی وجہ سے "علم و عمل" کی عوام میں قدر و منزلت بھی تھی۔ اس اخبار میں اس زمانے کے تقریباً سبھی بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا گیا۔ اس اخبار میں رعایا کے ساتھ ساتھ بادشاہ وقت اعلیٰ حضرت غفراںمکاں نواب میر محبوب علی خان کا کلام بھی شائع ہوا کرتا تھا۔

مختلف شعرا کے کلام کے علاوہ اس میں مفید اور معلوماتی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۴ ر ستمبر ۱۹۰۴ء کے "علم و عمل" میں انگلستان میں عام تعلیم و تربیت کو کیونکر ترقی ہوئی۔ اور انڈیا آفس کا کتاب خانہ جیسے اہم اور ادبی و علمی مضامین بھی شامل تھے۔ ان مضامین اور خبروں کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اب ہماری زبان اور ہمارے لہجے میں بھی فرق آچلا تھا۔ زبان کی اصلاح محب حسین کا گراں قدر کارنامہ ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اردو صحافت کو انداز دیا۔ اور یہی صحافتی انداز آگے چل کر ہماری روایت بن گیا۔ رسالہ طبابت کی زبان اور اس کے لہجے کو ذہن میں رکھتے ہوئے درج ذیل عبارت پڑھیئے:

"ولایت کا مشہور پہلوان سینڈو آج کل ہندوستان آیا ہوا ہے اور نومبر

کی کسی تاریخ ریلوے تھیٹر الہ آباد میں اپنے کرتب دکھائے گا۔
یہ وہی سینڈو ہے جس کی کشتی رستم ہند غلام محمد پہلوان مرحوم سے ہوئی تھی
یہ ہی پہلوان ڈمبل کا (نئی قسم کا ہلکا نالی جس کی کسرت سے بازو وسینہ
اور کلائیوں میں بڑی طاقت آتی ہے) موجد ہے۔"
(۷ ستمبر ۱۹۰۴ء)

خبروں کے نیچے کسی خبر رساں ادارہ یا ماخذ کا کوئی نام پتہ نہیں ہوتا تھا۔ دراصل اس وقت تک بھی حیدر آباد میں ایسی کوئی نیوز ایجنسی قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی خبریں حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تھا۔ انگریزی اخباروں سے خبریں ترجمہ ہوا کرتی تھیں یا پھر محکمۂ اطلاعات کے اطلاعات پر تکیہ کیا جاتا تھا۔

"علم وعمل" کی وجہ سے زبان وبیان ہی میں انقلاب نہیں آیا بلکہ حیدر آباد کی جاگیردارانہ معاشرت میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ اور ایک ایسا طبقہ ابھرنے لگا جس نے تعیش پسندی بے راہ روی، ناعاقبت اندیشی، کاہلی، جہالت اور توہم پرستی کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کیا۔ مذہب، روایت اور رسموں کا گورکھ دھندہ بن گیا تھا۔ چند عبادات، اور چند روایات ہی کو اصل مذہب سمجھا جانے لگا تھا۔ اس بیماری کی جڑیں مضبوط تھیں اور مذہب کا یہ فرسودہ تصور اپنی تاریخ بھی رکھتا تھا۔ اس تصور کے خلاف قدم اٹھانا اور اصلاح معاشرت کا بیڑہ اٹھانا یقیناً کسی جہاد سے کم نہیں تھا۔ محب حسین پہلے مجاہد ہیں جنھوں نے جاگیردارانہ ذہن اور انداز فکر پر کاری ضرب لگائی۔ توہم پرستی اور روایت پرستی کے قلعوں پر چڑھائی کی۔ تعیش پسندی اور ذہنی جمود کے خلاف قلم اٹھایا اور فکر ودانش کے چراغ روشن کئے۔ "علم وعمل" کی راہوں کو استوار کیا۔ اسی وجہ سے یہ "دکن کا نیچری" اپنے عہد نو کا بانی کہلایا۔

شمالی ہند میں ظفر نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا وہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر کے بعد اور بیسویں صدی کے اوائل میں اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ سر سید کی

علی گڑھ تحریک ثمر آور اور نتیجہ خیز ثابت ہو رہی تھی[41]۔ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک نے شمالی ہند کے ہندوؤں کو بیدار کیا تھا۔ اور اس بیداری کے نتیجہ میں ملک کو آزاد کرانے اور ایک مقتدر، آزاد، اور خود اختیار حکومت کے قیام کا تصور جاگ اٹھا۔ ۱۹۰۰ء تک بھی حیدرآباد ایسی کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھا۔ اس کے کئی ایک معاشی، سماجی اور سیاسی عوامل تھے۔ لیکن یہ عدم وابستگی مدت دراز تک قائم نہ رہ سکی، آہستہ آہستہ سیاسی بیداری یہاں کی رعایا میں بھی پیدا ہونے لگی جو آگے چل کر "ذمہ دارانہ حکومت" کا مطالبہ اسی بیداری کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ بہت آگے کی باتیں ہیں محب حسین کے دور میں اپنے مطالبات کو منوانے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ احساس شمالی ہند کی سیاسی تحریکات کا ہی نتیجہ تھا۔ محب حسین نے اصلاحی مقصد کے ڈانڈے اسی سیاسی انقلاب سے ملائے۔ نتیجتہً گرمی، حدت، اور ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔ دراصل محب حسین اور ملا عبدالقیوم ان صحافیوں میں سے ہیں جنھوں نے حیدرآباد میں انڈین کانگریس کے قیام کی راہوں کو استوار کیا ہے اور جنھوں نے آگے چل کر" پیام، رعیت اور امروز جیسے قومی اور انقلابی اخباروں کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ محب حسین نہ ہوتے تو شاید "پیام" اور "رعیت" بھی شائع نہ ہوتے۔ بمبئی میں جب نیشنل کانگریس کا بیسواں اجلاس منعقد ہوا تو محب حسین نے اس کی تائید کی اور اس تعلق سے اپنے اخبار مورخہ ۱۰/ جنوری ۱۹۰۵ء میں اداری نوٹ لکھا۔ اس نوٹ سے ان کی حُبّ الوطنی، آزادی سے محبت اور عوامی اور قومی تحریک سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے:

"کیا اپنے حقوق کو دریافت کرنا۔ ان پر بحث کرنا۔ اور پھر انھیں ایک یادداشت کے طور پر سرکار کی خدمت میں روانہ کرنا کوئی جرم ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ تمام یورپ کی مہذب رعایا بھی اس جرم کی مرتکب ہے۔ یہ وہ چنگیز خانی اور نادر شاہی زمانہ نہیں ہے کہ رعایا اپنے حقوق کی نسبت ایک لفظ بھی مجمع عام میں زبان سے نکالنے

کی جرأت نہ رکھے۔"

محب حسین نے "علم وعمل کے ذریعے سیاسی بیداری پیدا کرنے کا گراں قدر فرض انجام دیا۔ اور یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جسے ہم جدو جہد آزادی کی تاریخ میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

صحیفہ

"صحیفہ" ابتدا میں ماہوار رسالہ تھا، جس کو رضی الدین کیفی نے ۱۹۰۵ء میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن معارف کی جانب سے دوبارہ جاری ہوا تو اکبر علی بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کے شریک کار ہو گئے۔ اور یہ ماہوار کی بجائے روزنامہ کر دیا گیا۔ لیکن روزنامہ "صحیفہ" میں بھی تاریخی اور ادبی مضامین کو جگہ ملتی رہی۔ "صحیفہ" حیدر آباد کا قدیم اخبار ہونے کی وجہ سے اکبر علی مرحوم کو اس کی قدامت پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ اس کے سرنامہ پر تحریر تھا۔

سب سے پہلا خادم ملک و ملّہ

اس سرنامہ سے "صحیفہ" کی پالیسی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اکبر علی درحقیقت قدامت پسند آدمی تھے لیکن کی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے اصول پسند آدمی بھی تھے۔ اس وجہ سے "صحیفہ" ان کے مزاج کا آئینہ دار بن گیا تھا۔ تاریخی مضامین کو خاص اہمیت کے ساتھ اس میں شامل کیا جاتا۔ وہ مذہبی آدمی بھی تھے۔ اس لئے مذہبی مقالات "صحیفہ" میں جگہ پاتے۔ وہ تاج آصفی کے وفادار تھے اس لئے حضور نظام کے کام اور کلام کی خصوصی اشاعت کی جاتی۔ وہ وارفتۂ دکن تھے اس لئے دکن کے مسائل کو پیش کیا جاتا اور انھیں اسلامی اور عالمی سیاست سے بھی دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے مسلمانوں کے عالمی مسائل سے عملاً دلچسپی کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ بلقان اور طرابلس کی جنگ کے زمانہ میں ہلال احمر

کی تحریک کے روح و رواں تھے ۔ اور اسی زمانے میں صحیفہ" کو روزانہ اخبار کی صورت میں نمایاں کیا ۔ اور مجاہدین کے لئے چندہ جمع کر کے روانہ کرتے رہے ۔ آخر الذکر کام میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم اور ملا عبدالباسط آپ کے شریک حال تھے ۔ اخبار اچھی طرح چلنے لگا تو سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے ۔ ختم جنگ بلقان پر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم کی بنیاد ڈالی ۔ سچ تو یہ ہے کہ کانفرنس مذکور مولوی محمد مرتضیٰ کی کوششوں کا نتیجہ ہے مگر آپ نے اس کام میں ان مرحوم کی بہت مدد کی اور اس لحاظ سے اس کے بانیوں میں شمار کئے گئے ۔

مولوی اکبر علی کو اردو اور فارسی ادب کا خاص ذوق تھا ۔ آپ کی مستقل تصنیف تو کتاب معجزۂ محبت کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو عربی سے ترجمہ کی گئی ہے لیکن مباحث مختلفہ پر جو مضامین آپ اپنے اخبار کے ذریعہ روزانہ شائع کرتے رہتے تھے ۔ وہ ہر طرح قابل قدر ہیں ۔ آپ زندگی سادگی کے ساتھ بسر کرتے اور تمام محنت و کوشش اخبار و متعلقات اخبار کے نشوونما پر صرف کرتے تھے ۔ تعطیل کے قائل نہیں تھے ۔ صبح سے شام تک کام میں منہمک رہتے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بغیر سوئے رات آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے ۔ اسی دلچسپی ، محنت اور خلوص کا نتیجہ تھا کہ "صحیفہ" بہت جلد عوام کا مقبول روزنامہ بن گیا ۔

مولوی اکبر علی کو ذات شاہانہ سے دلی وابستگی تھی ۔ چنانچہ "صحیفہ" میں نظام دکن میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی تازہ ترین غزلیں صفحہ اول پر نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں ۔ ان غزلوں کے ساتھ استاد السلطان حضرت جلیل مانک پوری کی رائے بھی شائع ہوتی ۔ جو "سبحان اللہ لاجواب غزل ہے" قسم کے چند مخصوص جملے ہر غزل کے ساتھ چھپا کئے جاتے تھے ۔

حضور نظام سے ان کی عقیدت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی بخوبی ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں حضور نظام جب شمالی ہند کے دورے پر نکلے تو اکبر علی بھی ہمراہ ہو گئے تاکہ دوران سفر

کے واقعات اپنے اخبار کے لئے بھیجتے رہیں اور صحیح صحیح خبریں حاصل کی جائیں۔ وہ "سفر شاہانہ" میں لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں حضور نظام رام پور، دہلی، اجمیر، اور لکھنؤ کے دورے پر نکلے، شمالی ہند میں عام طور پر سیاسی حالات بے حد خراب تھے اور کانگریس کی وجہ سے کافی تحریکات کو فروغ حاصل ہو چلا تھا۔ انھیں پی، ٹی، آئی پر بھی بھروسہ نہیں تھا کہ آیا وہ حضور نظام کے تعلق سے صحیح خبریں جاری کرے گی۔ چنانچہ انھوں نے ہمرکابی کا تہیہ کرلیا۔ جو خبریں اور مضامین انھوں نے "صحیفہ" میں شائع کیں اندرون ریاست انھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور شوق کی نگاہوں سے پڑھا گیا۔ بعد کو یہی مضامین اکبر علی نے "سفر شاہانہ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کئے۔

مندرجہ بالا واقعہ سے جہاں ان کی حضور نظام سے بے پناہ عقیدت کا پتہ چلتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صحیح خبروں کی اشاعت پر کس قدر زیادہ توجہ دی ہے۔ دراصل وہ ایک باسلیقہ اور صاف طبیعت کے صحافی تھے۔ اور یہی سلیقہ مندی اور صاف گوئی اردو صحافت کے لئے ان کی دین ہے۔

صحافت کی دیگر سیاسی اور ثقافتی و سماجی اقدار سے ہٹ کر بھی علمی دنیا میں "صحیفہ" کے علمی اور تاریخی مقالات نہایت شوق و دلچسپی کے ساتھ قدر افزا نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ "صحیفہ" کا ذاتی مطبع "صحیفہ پریس" بھی تھا۔ جس میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ اخبارات میں شائع ہوا کرتا تھا۔

۱۹۴۱ء میں اکبر علی کا انتقال ہو چکا تو مولوی محمد مظہر نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۴۸ء کے بعد بھی یہ اخبار قلیل مدت تک جاری رہا۔ اکبر علی کے انتقال کے بعد حقِ ملکیت کی نزاع پیدا ہو گئی تھی۔ اکبر علی کے فرزند طاہر علی نے مقدمہ دائر کیا جس کی وجہ سے کچھ دنوں اخبار بند رہا۔ لیکن پھر محمد مظہر نے "صحیفہ" مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ سے جاری کیا۔ محمد مظہر حیدرآباد کے قدیمی قومی خدمت گذار ہیں۔ اور بقول زینت ساجدہ "انھوں نے اپنے بھائی محمد تہنی کے ساتھ حیدرآباد کے روایاتی جمود اور انحطاط کو توڑنے

اور تعلیمی، سماجی، قومی بیداری پیدا کرنے کی بساط بھر کوشش کی اور آنے والی نسلوں کے لئے تجدید اور انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔

محمد مظہر ۹ر جون ۱۸۸۴ء کو محلہ رائی پیٹھ مدراس میں پیدا ہوئے، لیکن ساری عمر حیدر آباد میں گزاری، جہاں ان کے والد مولوی صفی الدین معتمدی عدالت و امورِ عامہ میں منتظم تھے۔ وہ "مخبر دکن" اور جریدہ روزگار کے مستقل لکھنے والوں میں سے ہیں۔ لارڈ مارلے منٹو ریفارمس پر جس جرأت اور بے باکی کے ساتھ انھوں نے قلم اٹھایا تھا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ مولوی اکبر علی کے انتقال کے بعد وہ چار سال تک "صحیفہ" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۳۶۷ھ میں خود انھوں نے ایک رسالہ "روح ترقی" جاری کیا تھا جو ڈھائی سال تک کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

مظہر صاحب نے زیادہ تر سیاسی، تعلیمی اور تاریخی موضوعات پر لکھا ہے۔ ان کے مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے کئی مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں قلمروِ آصفی کی دولت، دار العلوم کے سپوت، سیرت مصطفوی، مسائل دستور آصفی اور تذکرہ بابِ حکومت قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے حیات عزیز مرزا، تذکرہ اکابر حیدر آباد اور حیدر آباد کے دو سالہ نظم و نسق کی سرگزشت بھی مرتب کی ہے، لیکن ان کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ مظہر صاحب کا قابلِ قدر کام یہ بھی ہے کہ انھوں نے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام میں حصہ لیا۔ اور اس کے مختلف عہدوں پر انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔

محمد مظہر صاحب نے "صحیفہ" کی ان ہی اصولوں کو باقی و زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ جو مولوی اکبر علی نے اختیار کئے تھے۔ اکبر علی اور محمد مظہر دونوں صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ نئی پرانی قدروں کی پہچان رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے قدامت سے گریز کیا اور نہ ہی تجدید سے احتراز۔ دراصل دونوں ہی نے قدیم و جدید کی اچھائیوں کو اپنایا ہے۔ چونکہ دونوں کا انداز عالمانہ رہا ہے اس لئے سیاست کی گرما گرمی

اور جذباتیت "صحیفہ" میں نہیں ملتی۔ اس انداز و روش کو آپ میانہ روی اور اعتدال پسندی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

بہر حال "صحیفہ" اپنے وقت کا سنجیدہ اور مہذب اخبار تھا اور سنجیدہ و تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول بھی تھا۔ "صحیفہ" کے نام کے ساتھ ہی کیفی، اکبر علی اور محمد مظہر کے نام اور کارنامے ذہنوں میں تازہ ہو جاتے ہیں۔ ان ناموں کو ہم تاریخ صحافت میں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

رہبرِ دکن

"رہبرِ دکن" اپنے معاصرین میں مقبول عام اخبار تھا۔ حکومت بھی اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ تمام سرکاری محکموں میں سرکاری طور پر خرید اجاتا تھا۔ اس میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں وہ ہر اعتبار سے مصدقہ اور مبنی بر حقیقت ہوتی تھیں۔ نظم و نسق حکومت کی کوتاہیوں اور خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے مفید اصلاحی تجاویز پیش کی جاتی تھیں۔ حضور نظام بطور خاص اسے ملاحظہ فرماتے اور ریاست کے عام حالات سے واقف ہوتے، قابل توجہ شکایات پر متوجہ ہوتے اور ان کے ازالہ کے لئے اپنی حکومت کی مشنری کو حرکت میں لاتے۔ کوئی اصلاحی، علمی اور مفید عام تحریک ہوتی تو "رہبرِ دکن" اس کو پروان چڑھانے میں پیش پیش رہتا۔ مخرب الاخلاق و خلاف مذہب تحریکات کی وہ سخت مخالفت کرتا اور انھیں ناکام بنانے کی کامیاب کوشش کرتا۔ اس کے خاص عنوانات کے تحت جو مضامین شائع ہوتے تھے وہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے۔ وہ نوخیز اہل علم کے نگارشات کو اپنے صفحات پر شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اس طرح اس کے لکھنے والوں کا ایک خاصہ حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک دبستان صحافت تھا۔ جس نے بہت سے مترجمین اور مضمون نگار پیدا کئے اور عوام میں اخبار بینی کا شوق اور صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں میں اخبار نویسی کا ولولہ پیدا کیا۔ کتابت، طباعت اور خبروں کی ترتیب اور مضامین کے انتخاب

غرض نقطۂ نظر سے بہت جاذب نظر اخبار تھا۔

"رہبر دکن" جون ۱۹۲۰ء م ۲۶ / شہریور ۱۳۳۰ف سے دارالسلطنت سے شائع ہونے لگا۔ ابتدا میں یہ چھوٹی تقطیع کے ۴ صفحات پر لیتھو کے دستی پریس پر شائع ہونے لگا۔ صفحہ اول پر بالالتزام مقامی شعرا کی ایک منتخب غزل اور ایک طویل مضمون کسی نہ کسی عنوان پر شائع ہوتا۔ خبریں زیادہ تر مقامی ہوتی تھیں جو عوام کی دلچسپی اور ضروری معلومات کی ہوتی تھیں۔ آگے چل کر یہ ۶ صفحات پر اور کبھی ۸ صفحات پر شائع ہونے لگا اس میں انگریزی اخباروں سے ماخوذ مختلف نوعیت کی خبریں اور دیگر اردو اخبارات کے انتخابات ہوتے تھے۔ پھر ترقی کی ایک ایسی منزل آئی کہ وہ برقی پریس پر شائع ہونے لگا۔ ممتاز اور مشہور شخصیتوں کی تصاویر کے اضافہ سے اخبار اور بھی مقبول ہوگیا دلی۔ لندن۔ اور بیروت میں اس کے نامہ نگار متعین تھے جو خصوصی اور اہم خبریں ذریعہ تار برقی روانہ کرتے تھے۔ یہ خبریں تازہ ترین تار کے عنوان سے شائع ہوا کرتی تھیں جو اخبار بین طبقے میں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ہفتہ جنگ کے عنوان سے نامہ نگاروں کی مرسلہ خبریں بڑے اہتمام سے صفحہ اول پر شائع ہوا کرتی تھی۔ ترجمہ بھی بہت سلیس اور شگفتہ ہوتا تھا۔ جنگ جب ۱۹۴۴ء میں اختتام کو پہنچی تو "رہبر دکن" کا ایک خصوصی باتصویر ضخیم نمبر شائع ہوا جو عوام میں بہت مقبول ہوا۔

"رہبر دکن" میں حضور نظام کا کلام اور ان کے وہ پسندیدہ مضامین جو ہوش بلگرامی کے قلم سے ہوتے تھے سرکاری نگرانی میں شائع ہوتے تھے۔ بیرونی تجارتی فرموں کے بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوتے تھے جو رہبر دکن کے کثیر الاشاعت ہونے کا بین ثبوت تھا۔ اور وہ اس لحاظ سے دکن کا منفرد اخبار تھا۔ اخبار میں جو مضامین اور خبریں وغیرہ شائع ہوتیں ان کی تصحیح کا غایت درجہ اہتمام ہوتا تھا جس کے نتیجے میں اخبار غلطیوں سے پاک ہوتا تھا۔ بایں ہمہ ایک لطیفہ یہاں قابل ذکر ہے۔

اعلیٰ حضرت کے اور ان سے متعلق غلام رسول کاتب لکھا کرتے تھے۔ جو بڑے خوشنویس کاتب تھے۔ ایک مضمون حضور نظام سے متعلق تھا جس میں لفظ "بندگانعالی" بکرات ومرّات استعمال ہوا تھا، وہ سہو کتابت سے "بندر گانعالی" شائع ہوگیا۔ بوقت تصحیح مصححین سے جو سہو نظری ہوگئی۔ اس سے اندیشہ عتاب سلطانی کا پیدا ہوگیا تھا بعد کو یہ معاملہ کسی طرح رفع دفع ہوگیا اس کے بعد تصحیح کا اور بھی زیادہ اہتمام ہونے لگا۔ تصحیح قرأت وسماعت کے ذریعہ کی جاتی اور کاپی تصحیح ہونے کے بعد جملہ سب ایڈیٹروں کی نظر سے گزرا، بعد ازاں پروف کی اسی اہتمام سے تصحیح ہوتی باوجود اس سعی بلیغ کے عملہ ادارت کو اخبار مطبع سے طبع ہوکر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچنے تک غلطی کا دغدغہ لگا رہتا تھا!

خوش قسمتی سے رہبر دکن کو پڑھے لکھے خوشخط کاتب میسر تھے۔ جو بڑی دیانت اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ سب سے بڑھ کر ان کو اخبار اور مالکِ اخبار سے خلوص بھی تھا جس کی مالک اخبار قدر بھی کرتے۔ ان کو ماہانہ بروقت تنخواہ دینے کے خصوصی مواقع پر انعام واکرام کی نوازش کرتے کہ ع

مزدور خوش دل کند کار بیش

جن دنوں گاندھی جی ملک کی مشہور عالم ستیہ گرہ کر رہے تھے عوام کو ان کی گرفتاری کی بڑی تشویش تھی جس کا ہر آن خطرہ لگا ہوا تھا۔ اس دوران میں دلی کے نامہ نگار نے ان کی گرفتاری کی خصوصی خبر رہبر کو دی تھی جس کا ٹیلی گرام دفتر میں رات کو اتنی تاخیر سے ملا تھا کہ رات میں کام کرنے والے سب ایڈیٹر اپنا کام ختم کرکے اپنے گھر جا چکے تھے۔ وہ ٹیلی گرام ان کاتب کے ہاتھ لگا جو کاپی طبع کرانے مطبع کو جا رہے تھے۔ وہ بہت بود انگریزی جانتے تھے۔ انھوں نے یہ تار پڑھ کر خبر کی اہمیت محسوس کی اور جھٹ سے کوئی غیر اہم حذف کرکے گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر نمایاں کرکے لکھ دی اور وہ اسی طرح اخبار میں شائع ہوگئی۔ دوسرے دن بجز ایک دو کے اخباروں کے کسی اردو اخبار میں یہ خبر شائع نہ ہوسکی جس سے اخبار کا وقار عوام میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اور عوام نے اس خبر کا بڑا چرچا

ہوا۔ ادھر "رہبر دکن" کے عملہ ادارت میں اس پر بڑا تعجب ہوا کہ یہ خبر کیونکر شائع ہوگئی۔ جب کہ رات کے ذمہ دار ایڈیٹر نے سرے سے ایسی کوئی خبر ترجمہ نہیں کی تھی۔ تحقیق کرنے پر جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو مولوی احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر "رہبر دکن" ان کاتب صاحب کو جن کا نام عبدالاحد تھا اس مخلصانہ حسن کارگزاری کا صلہ ایک سو روپے دیا جو ان کی تنخواہ سے چند گنا زیادہ تھا۔

مولوی احمد محی الدین کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی وہ غالباً نظام کالج میں بھی زیر تعلیم رہے مگر علی گڑھ سے گریجویشن کیا لیکن بجائے سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے اخبار نکالنے کا عزم کرلیا۔ ان کے دیرینہ ساتھی و ہم مدرسہ مولوی عبداللہ خان ان کے شریک کار ہوئے۔ ان سے بڑے ان کے ایک بھائی مولوی یوسف الدین اخبار کے مہتمم بنے۔ وہی اخبار کی طباعت، اشاعت کے سارے انتظامات کرتے۔ یوں تو وقفہ وقفہ سے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان بحیثیت مترجم "رہبر دکن" کی مجلس ادارت سے وابستہ رہے۔ لیکن مستقلاً عبداللہ خاں کے علاوہ عبدالحمید خاں جو بعد کو ایڈیٹر "الہدیٰ" ہوئے اور شفیع الدین جنھوں نے اپنا قلمی نام ناکارہ حیدر آبادی اختیار کرلیا تھا مجلس ادارت سے منسلک رہے۔ عبداللہ خاں زیادہ تر اداریہ لکھتے اور اشتہارات کا ترجمہ کیا کرتے حسب موقع وہ دو حضرات بھی اداریہ لکھتے لیکن "رہبر و رہرو" کا مزاحیہ کالم ہمیشہ ناکارہ صاحب ہی لکھا کرتے۔ یہ صاحب بظاہر بہت سنجیدہ اور کم سخن تھے مگر طبیعت میں بہت شوخی تھی۔ ترجمہ بہت سلیس اور جلد کرتے تھے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "صمرانی" ان کی شان ظرافت کا مرقع ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ جاری تھی اس دوران میں مولوی احمد محی الدین اور اس کے تھوڑے دنوں بعد مولوی یوسف الدین مہتمم "رہبر دکن" کا انتقال ہوگیا۔ اس سے اخبار کا اندرونی ڈھانچہ متزلزل ہوگیا اگرچہ اخبار بدستور جاری رہا۔ مہینوں مولوی سید احمد محی الدین مرحوم کے تعزیتی خطوط "رہبر دکن" میں شائع ہوتے رہے۔ جس سے ان کی شہرت و

مقبولیت کا خوب اندازہ ہوتا ہے ۔ان کے بعد اخبار کی ادارت ان کے بڑے صاحبزادہ سید حامد معین الدین ایچ ،سی ،ایس کے نام منتقل ہوئی ۔جو دفتر تنقیح حسابات میں مددگار تھے ۔ بعد میں محمد منظور حسن انصاری مدیر اور سید محمود وحید الدین فرزند دوم مولوی سید احمد محی الدین مینجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے جو ابھی ابھی بی ایس سی کامیاب ہوئے تھے ۔عبد الحمید خاں اور مولوی عبد اللہ خاں نے ان کو اخبار نویسی کی تربیت دی ۔عبد اللہ خاں صاحب اور ناکارہ صاحب کی خرابی صحت کے سبب اخبار کے کام میں خلل آنے لگا ۔جامعہ عثمانیہ میں ہمناباد کے ایک صاحب سید ضیاء الدین وحید ایم اے کر رہے تھے ۔مفتی عبدہ پر مقالہ تیار کر رہے تھے ۔یہ ان دنوں ۵۰ روپے ماہانہ پر "رہبر دکن" میں ترجمہ و تصحیح پر مامور تھے لیکن ترجمہ کا کام اتنا زیادہ تھا کہ ایک مترجم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ۔چنانچہ ضرورت مترجم کا اشتہار شائع ہوا ۔اس موقع پر شبلی یزدانی کا ۶۰ روپے ماہانہ پر بحیثیت مترجم تقرر کر لیا گیا کیونکہ روزنامہ "پیام" میں ان کے بکثرت مضامین کی اشاعت ان کی شہرت و قبولیت کا باعث ہوئی تھی ۔ یہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ مذہبی اور مقامی مسائل پر اداریئے بھی لکھا کرتے تھے ۔ دو تین سال بعد خرابی صحت کی بنا پر یہ "رہبر دکن" کی ملازمت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے ۔اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد حیدر آباد پر انڈین یونین کا "پولیس ایکشن" ہو گیا ۔چونکہ "رہبر دکن" انڈین یونین میں ریاست حیدر آباد کی شمولیت کی مخالفت کرتا تھا اور اس معاملہ میں حکومت وقت اور رضا کاروں کا ہمنوا تھا ۔اس لئے جنرل جے ۔این چودھری کی فوجی حکومت نے آزادی حیدر آباد کی حمایت کی پاداش میں اس اخبار کو بند کرنے کے احکام جاری کئے ۔ عین اس وقت جب کہ رات کی کاپی مطبع کو روانہ ہو رہی تھی ، مدیر "رہبر دکن" کو مسدودی کے احکام وصول ہوئے ناچار اخبار کی اشاعت بند کر دینی پڑی "رہبر دکن" نے ہمیشہ ان تحریکات کی مخالفت کی جو کسی نہ کسی طرح حکومت اور عوام کے مفاد کے خلاف تھیں ، مخلوط تعلیم ، بے پردگی اور از یں قبیل دیگر مفاسد کی

شدت سے مخالفت کی۔ اس کے سالنامے اور خصوصی اشاعتیں عوام میں بہت مقبول تھے۔ اس کے قلمی معاونین میں حضرت علامہ عمادی، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر حمید اللہ جیسے مشاہیر شامل تھے۔ صدق کی سچی باتیں اور ابوالخیر صدیقی کی "سائنس کی دنیا" لوگ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ عہد عثمانی میں اردو سرکاری زبان تھی جس کی ترقی میں اردو صحافت نے زبردست حصہ لیا۔ اس معاملہ میں "رہبر دکن" بہت پیش پیش رہا ہے۔

دفتر "رہبر دکن" میں جو لوگ ملازم تھے ان کے ساتھ مالکین اخبار فیاضانہ سلوک کرتے تھے، اور ان کی سہولت کا خیال رکھتے اور انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ اگر کسی کا انتقال ہوتا تو اس کی تجہیز و تکفین دفتر کی جانب سے ہوتی۔ بیوہ کے نام تاحیات مناسب وظیفہ دیا جاتا۔ ملازمین کو قرض کی ضرورت ہوتی تو بلا تامل دیا جاتا اور آسان اقساط پر اس کی وصولی ہوتی۔ "رہبر دکن" کا مالیہ بہت مستحکم تھا جس سے اخبار کو ہر طرح ترقی ہوئی۔ وہ ان دنوں جنوبی ہند کا واحد کثیر الاشاعت اخبار شمار ہوتا تھا اور ہر لحاظ سے ایک وقیع اخبار تھا۔ معاصرین میں بجز "پیام" کے کوئی اس کا حریف نہ تھا سیاسی نظریات دونوں اخباروں کے بالکل جداگانہ تھے اور اخباری مسلک بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ اس لئے ان دونوں میں اکثر نوک جھونک رہتی۔ یہ دونوں اپنے مزاحیہ کالموں میں ایک دوسرے پر پُر لطف انداز میں لعن و طنز کیا کرتے تھے جسے اخبار بیں طبقہ مزے لے لے کے پڑھتا تھا۔

نظام گزٹ

روزنامہ نظام گزٹ تقریباً چالیس سال تک حیدرآباد کی صحافت میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ ۱۹۲۷ء سے لیکر ۱۹۶۷ء تک حیدرآباد کی زندگی میں مدوجزر بھی آتے رہے اور انقلاب بھی! لیکن نظام گزٹ کی متانت، سنجیدگی اور رواداری میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ وہ وفاداری بشرطِ استواری کے مسلک پر قائم رہا اور شروع ہی سے حضور نظام آصف سابع کے خیالات کی ترجمانی میں پیش پیش رہا۔ آخر آخر زمانہ میں یہی واحد اخبار تھا جس میں نذری باغ سے جاری کردہ حضور نظام کی تحریرات بالالتزام شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ مختلف تحریرات 'نذری باغ' کے نجی اور اندرونی حالات کا آئینہ ہوتے۔ ۱۹۴۸ء سے قبل "فرمان" کی نوعیت عوامی ہوتی تھی، لیکن پولیس کاروائی کے بعد "فرمان" کے حدودِ سلطنت بھی کنگ کوٹھی اور اس کے نواحی حالات کے حد تک محدود ہوتے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور مسائل کے لحاظ سے یہ حضور نظام سابع کے مخصوص اندازِ فکر اور منفرد اندازِ تحریر کا نمونہ ہوتے۔ اکثر و بیشتر کلام، قطعہ وغیرہ بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ بابائے صحافت، مولوی وقار احمد کے انتقال (۱۹۵۹ء) کے بعد بھی عبدالرحمن صاحب حلمی کی نگرانی میں ایک مختصر سے عرصہ تک یہ اخبار جاری رہا۔

حبیب اللہ رشدی نظام گزٹ کے موسس اور بانی ہیں۔ انھوں نے اپنے دوست وقار احمد کے تعاون سے جو ان دنوں مشیرِ دکن سے وابستہ تھے۔ پہلے

ہفتہ وار اور بعد میں روزنامہ کی صورت میں نظام گزٹ کو جاری کیا۔ حبیب اللہ رشدی کو دکن کے بہترین شعرائیں شامل کیا جاتا ہے۔ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہوتے ہی انھوں نے اپنا نام پیدا کیا۔ اور اپنے روزنامہ کو ایک متین اور سنجیدہ بھی اور ترقی پسندانہ لہجہ ادا کیا۔ رائے کے اظہار میں وہ نہایت محتاط اور میانہ رو تھے۔ یہ خوبیاں نظام گزٹ کی بھی بن گئیں۔ اس اخبار کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں حبیب اللہ رشدی اور وقار احمد کے علاوہ محمد علی کاظمی اور احسن علی مرزا اور بعد میں وہاب حیدر، محمد یعقوب، شریف اسلم، عبدالرحمن علمی اور ہاشم ملتانی بھی اس سے وابستہ تھے۔ ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلی کے بعد حبیب اللہ رشدی اور محمد علی کاظمی پاکستان منتقل ہو گئے۔ حبیب اللہ رشدی مولانا اعجاز الحق قدوسی کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ سے منسلک ہو گئے۔ اور یہاں وقار احمد نے نظام گزٹ کی ادارت سنبھالی۔

وقار احمد جامعہ عثمانیہ کے دورِ اوّل کے ان فرزندوں میں سے تھے جنھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور سلجھے ہوئے مذاق کی وجہ سے عوام اور سرکار دونوں میں مقبولیت حاصل کی۔ وقار احمد اپنے دیرینہ تجربہ اور صلح کل مشرب کی وجہ سے صحافتی برادری میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انجمن صحافت کے وہ تین مرتبہ صدر منتخب ہوئے۔ مقننہ حیدرآباد میں صحافتی نمائندے کی حیثیت سے رکن نامزد ہوئے۔ اور پولیس ایکشن کے بعد صحافتی مشاورتی بورڈ کے رکن رہے۔

حیدرآباد میں سیاسی خلفشار کے دور میں اردو اخبارات مختلف خانوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ تھے جو اپنی دانست میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ایسے اخبارات میں رہبر دکن، صبح دکن، میزان، مجلس، تنظیم، صحیفہ، معارف، اتحاد، مستقبل، جناح، آغاز اور پرچم (ہفتہ وار) شامل تھے۔ دوسرے وہ جو قومی تحریکات کو آگے بڑھا رہے تھے جس میں یقیناً علم وعمل بھی سرفہرست تھا پیام، سلطنت، نظام گزٹ، رعیت، امروز اور سیدالاخبار

بھی ایسے ہی اخباروں میں شامل ہیں۔ لیکن ان اخباروں میں بھی واضح خط کھینچنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ نظام گزٹ، سلطنت اور سید الاخبار ایسے اخبار میں جو 'پرچم آصفی' کو بلند رکھنے کی کوشش کی ہے وہ عوام سے زیادہ "شاہ" پرست رہے ہیں۔ چوں کہ 'شاہ' اور مسلمانوں میں اندرونی کش مکش جاری تھی اس لئے بھی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ نظام گزٹ کا رویہ اعتدال پسندانہ رہا ہے وہ مسلمانوں میں مقبول نہیں تھا۔ اس پر تو قاسم رضوی صاحب کا عتاب تھا۔ انھوں نے اتحاد المسلمین کے ایک جلسہ مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ وہ نظام گزٹ نہ پڑھیں۔ اس لئے نظام گزٹ ابھی عام مسلمانوں میں پیام، رعیت اور امروز کی طرح "شجر ممنوعہ" بنا ہوا تھا۔

پولیس کاروائی سے قبل میر کاظم علی صاحب کی وجہ سے یہ ڈان کا چربہ ہوا کرتا تھا۔ میر کاظم علی بڑے ذہین اور قابل صحافی تھے اور وہ "ڈان" کا ترجمہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں احسن علی مرزا بھی نظام گزٹ سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۲۵ روپیہ ماہوار انھیں یافت ملا کرتی تھی۔ ان کے علاوہ دیگر ترقی پسندوں نے بھی نظام گزٹ میں کام کرنا شروع کیا۔ اس لئے اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ یہ کمیونسٹوں کا گھونسلہ بن گیا۔

"نظام گزٹ" کی سیاسی اہمیت تو ہے ہی وہ ادبی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء سے قبل اس کے سالگرہ نمبر خاصی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۳۵۳ف کے سالگرہ نمبر میں مولوی عبدالحق کا مضمون 'جائزہ زبانِ اردو' اور سنہ ۱۳۵۲ھ کے نمبر میں مولوی محمد مہدی صاحب کا مضمون حیدرآبادی صحافت کی تاریخ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور کے ادیبوں اور شاعروں کے مضامین، افسانے اور منظومات بھی ملتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد بھی اس کی ادبی اہمیت برقرار رہی۔ اس اخبار کے بند ہونے سے دس بارہ سال قبل ہی سے اس میں بچوں کا صفحہ بھی شائع ہونے لگا تھا

سنہ ۱۹۵۴ء کے بعد دو چار سال تک تقریباً سبھی اخباروں نے بچوں کے لئے اپنے اخباروں میں کالم مختص کرنا شروع کیا تھا۔ نظام گزٹ نے بھی بچوں کے ادبی ذوق کو

اُبھارنے، بنانے میں نمایاں فرض انجام دیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس کے آزادی نمبر، ادب و سیاست میں اپنی متنوع مزاجی اور شعور کی وجہ سے مقبول رہے ہیں، نظام گزٹ ۱۹۴۸ء کے بعد اپنے کارٹون کی وجہ سے بھی کام مقبول ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں دو ہی کارٹونسٹ ایسے تھے جو عوام میں بے حد مقبول سمجھے جاتے۔ پہلے وہاب حیدر تھے دوسرے نمبر پہ ہاشم ملتانی۔ ہاشم ملتانی نظام گزٹ سے وابستہ تھے۔

وقار احمد صاحب کی وفات ۱۹۵۹ء نے نظام گزٹ کے دن بھی پورے کیے، گو ۱۹۶۷ء تک عبدالرحمٰن صاحب حلمی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ لیکن ان دنوں نظام گزٹ عوام میں نامقبول ہو چلا تھا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سید فاروق احمد صاحب کی ادارت میں نظام گزٹ روزنامہ سے سہ روزہ اخبار ہو گیا لیکن اس کا وجود عدم کے برابر ہی رہے۔

صبحِ دکن

روزنامہ 'صبح دکن'، ۲۱ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ (مطابق ۱۹۲۸ء) میں زیر ادارت احمد عارف جاری ہوا۔ علی اشرف اور وحید الحق صوفی اس روزنامے کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ان کے علاوہ معین الدین قریشی، اکبر وفاقانی اور ممتاز شاعر شاہد صدیقی مرحوم بھی اس سے وابستہ تھے۔ شاہد صدیقی اداریہ نویسی کا بھی فرض انجام دیا کرتے تھے۔ صبح دکن ابتداً میں ہفتہ وار تھا ۱۳۴۷ھ سے روزانہ شائع ہونے لگا۔ جامعہ عثمانیہ کے نوعمر قلم کاروں نے دکن کے مخصوص ماحول میں اس اخبار کو ایک خاص مقام دلایا تھا۔ اس اخبار میں آصف جاہ سابع کے خصوصی تحریرات اور ان کا اردو فارسی کلام زیادہ تر شائع ہوا کرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس اخبار کو دکن مسلم مفادات کا حامی اردو روزنامہ سمجھا جاتا رہا۔ حالانکہ یہ اپنے وقت کا اعتدال پسند اخبار تھا۔ یہ صحیح ہے کہ 'صبح دکن' کے شاہِ وقت کی سالگرہ کے موقع پر خصوصی نمبر ۱۳۴۹ھ اور ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئے۔ اس قسم کے نمبر اس وقت کے تقریباً سبھی اخبار شائع کرتے تھے۔ اور تقریباً ہر اخبار میں حضور نظام کی شان میں نظم و نثر میں قصیدے لکھے جاتے، اس معاملہ میں 'صبح دکن' کا انداز منفرد تھا۔ اس میں علمی اور ادبی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جاتی، چنانچہ ۱۳۴۹ھ کے سالگرہ نمبر میں حقیقی جامعہ، مغرب کے چند مشاہدات، لباس اور قومیت، ازدواج، دکن کی عمرانیت پر ایک نظر اور حیدرآباد معاشی نقطۂ نظر سے وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین شامل تھے۔ اس کا خود مختاری دکن نمبر بھی صحافتی اہمیت رکھتا ہے۔

صبح دکن کو حیدر آباد کے تقریباً سبھی بڑے اور نامور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا تعاون قلم حاصل تھا۔ چنانچہ ایسے معروف و مشہور ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر عبد اللطیف ڈاکٹر میر سیادت علی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، میر ولی الدین، عبد اللہ عمادی، جوش ملیح آبادی، شمس اللہ قادری، فرحت اللہ بیگ، عبد الرحمٰن خان، حبیب اللہ حسینی، فیض الدین، حبیب اللہ رشدی، عبد المجید صدیقی، سید علی اصغر، ابو الکلام بدر الدین بدر وغیرہ شامل ہیں۔

اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ بھی رہی کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانہ میں دن میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب حیدر آباد انڈین یونین میں شامل ہو گیا تو اس کے "صدمہ" سے معین الدین قریشی جانبر نہ ہو سکے۔ اکبر وفاقانی سقوط حیدر آباد کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں ناقدریٔ ارباب فن کا نشانہ بنے رہے۔ یہ دکن کے مشہور ایڈوکیٹ، مصنف، ادیب، صحافی اور شاعر تھے۔ کچھ دنوں پاکستان کے روزنامہ "انقلاب" کراچی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ انھیں صحافت کا وسیع تجربہ تھا۔ جب تک وہ حیدر آباد میں رہے صبح دکن کے علاوہ "معلن"، اور "وقت" میں بھی وہ کام کرتے رہے۔ وہ اچھے آرٹسٹ بھی تھے چنانچہ ان کا زیادہ تر وقت مصور عبد القیوم مرحوم کے اسٹوڈیو میں گذرتا تھا۔ اور ان کا زیادہ تر وقت اپنے پیشۂ وکالت کے بجائے تصویروں کے خطوط اور رنگ آمیزیوں کے نقد و بحث میں گذرتا تھا۔ وہ اچھے ڈرامہ نگار بھی تھے انھوں نے بزم تمثیل کی بنیاد ڈالی۔ اس بزم کے لکھنے والوں میں خود اکبر وفاقانی، عزیز احمد، ظفر الحسن، مخدوم محی الدین، میر حسن اور ناکارہ حیدر آبادی تھے۔ اس بزم کے ناٹک تمثیل جو حیدر آباد کی پرانی اور نئی قدروں کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی جھلکیوں کی غمازی کرتے تھے۔ ان کا دوسرا صحافتی کارنامہ "حسن کار" کی اجرائی بھی تھا۔ مختصر ایسا باکمال عثمانین کسمپرسی کی حالت میں بہ عارضۂ کینسر کراچی میں روز دوشنبہ ۲۷ مئی ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گیا۔

شاہد صدیقی عرصہ دراز تک حیدر آباد کے مختلف رسالوں اخباروں سے وابستہ رہے۔ اپنے آخری زمانہ میں وہ روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام 'چراغ منزل' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ "شیشہ و تیشہ" کے مزاحیہ کالم بھی لکھتے رہے۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو جواں عمر مزاح کار مجتبیٰ حسین نے "شیشہ و تیشہ" کے ہی نام سے ان کالموں کو کتابی صورت میں ترتیب دیا ہے۔

علی اشرف کے بعد کو تنظیم بھی جاری کیا تھا۔ بہرحال صبح دکن سے وابستہ صحافی حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں اپنی گوناں گوں صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

احمد عارف دارالعلوم کے تعلیم یافتہ تھے۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اس وجہ سے جلد ہی ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ اور جب انھوں نے 'صبح دکن' جاری کیا تو اپنی متانت، سنجیدگی اور وسیع النظری کی وجہ سے اپنا اور اپنے اخبار کا نام چمکا گئے۔ ان کی میانہ روی اور اعتدال پسندی نے انھیں مقبول بنا دیا۔ اور صبح دکن کو اس صلح کل پالیسی کی وجہ سے شہرت ملی۔

روزنامہ صبح دکن تاریخ ادب و صحافت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑنے کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن سے پیدا شدہ حالات کا شکار ہو گیا۔ احمد عارف کا انتقال سنہ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے احمد معظم عرصہ تک روزنامہ "سیاست" سے وابستہ رہنے کے بعد دلی منتقل ہو گئے۔ جہاں انھوں نے کمیونسٹ ارگن "حیات" کی ادارت سنبھالی۔

پیام

روزنامہ "پیام" حیدرآباد کی صحافتی اور ادبی زندگی میں نئی قدروں اور نئی باتوں کا پیامبر بن کر طلوع ہوا۔ اور اس نے اپنی بے باک ترجمانی اور جرأت مندی سے زندگی کو براہ ارتقاء انقلاب سے دوچار کیا۔ اور انقلابِ زمانہ میں ڈوبتوں کو سہارا بھی دیا اور سنبھالا بھی۔ حیدرآباد کے اخباروں میں پیام بھی ایک اخبار تھا لیکن منفرد و یکتا! اس کی اپنی انفرادیت تھی اور بعض خصوصیات میں یکتا تھا۔ اس کا دور حیدرآباد میں سیاسی زندگی کا بحرانی دور تھا اور یہ بحران کنگ کوٹھی کے اندر بھی اور کنگ کوٹھی کے باہر "دارالسلام" میں بھی پرورش پا رہا تھا۔ نعرۂ تکبیر کے پُرجوش نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ "آزاد حیدرآباد" کے ترانے گائے جانے لگے تھے۔ ایک طرف کنگ کوٹھی کے اندر مصالحت اور اپنی گدی کی حفاظت کی تیاری ہو رہی تھی اور دوسری طرف "مجلس" نے دارالسلام میں آزاد حیدرآباد کی تحریک کو ہوا دی تھی۔ عوام ہاتھ میں تلوار نہ ہونے کے باوجود آمادۂ پیکار تھے مختصراً حیدرآباد میں سیاسی بے اطمینانی اور بے چینی عام ہو چلی تھی۔ جوش اور جنون کے اس اندھے سیلاب کو "پیام" نے روکنے اور قومی رجحانات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ کام مشکل تھا اور مشکلات سے دوچار بھی ہونا پڑا۔ اس کے نتیجہ میں روزنامہ پیام مختلف ادوار میں بحرانی حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ دراصل پیام کے فائل خصوصاً ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ اور اس زمانہ کے اخبارات مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور کے سارے شمارے مکمل تاریخ تو نہیں، اوراقِ تاریخ کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

مئی ۱۹۳۵ء میں قاضی عبدالغفار نے پیام جاری کیا۔ وہ قوم پرست مسلمان تھے

اور محمد علی جوہر کے تربیت یافتہ تھی۔ انہوں نے خلافت تحریک میں حصہ لیکر سیاست سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جس زمانہ میں قاضی صاحب نے "پیام" جاری کیا اس وقت کی حیدرآبادی صحافت خاصی ولولہ انگیز تھی اور جنوں خیز بھی۔ "پیام" نے اپنی راہ اختیار کیا۔ متین اور سنجیدہ!!۔ پالیسی اعتدال پسندانہ تھی کیونکہ قاضی صاحب خود بھی اعتدال پسند ادیب و صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔

روزنامہ "پیام" مئی ۱۹۳۵ء سے ۱۰ر فروری ۱۹۴۷ء تک اپنی فضا اور اپنا ماحول پیدا کر چکا تھا۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دیسی اور بدیسی خبروں کی فراہمی کے علاوہ ریاستی، ہندوستان اور بین الاقوامی مسائل پر ادارے اور تبصرے شائع کئے جانے لگے اور تشنہ لبان ادب کے لئے قاضی صاحب کی تحریریں آبِ حیات تھیں۔ مسلسل کالموں کے ذریعہ "پیام" نے اپنے چاہنے والوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ بھی جو پیام کی پالیسی سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے قاضی صاحب کی طرزِ نگارش پر مرتے تھے۔ اس لئے پیام پڑھتے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پیام کی اشاعت کے ساتھ ہی صحافتی زبان بھی معیاری اردو سے زیادہ مطابق ہو گئی اور ادبی چاشنی بھی اس میں شامل ہو گئی۔

قاضی صاحب کے ادارے بہت ہی بصیرت افروز ہوا کرتے تھے نہ صرف حیدرآباد کی اور ہندوستانی سیاست بلکہ عالمی سیاست کے تعلق سے بھی وہ قلم اٹھایا کرتے تھے۔ قاضی صاحب عالاتِ حاضرہ، کے موضوع پر دکن ریڈیو سے ماہانہ تقریر نشر کرتے تھے جو دکن ریڈیو کا نہایت مقبول پروگرام تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے اندازِ بیاں اور طرزِ نگارش کے ذریعہ صحافت اور ادب کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ جب انہوں نے پیام سے علیحدگی اختیار کر لی تو اس کے بعد اردو زبان کا زوال شروع ہوا اور وقائع نگاری، صحافت اور ادب دو مختلف خانوں میں بٹ گئے۔ پیام سے پہلے بھی جتنے اخبار تھے وہ ایک حیثیت سے جریدۂ غیر معمولی کا چربہ ہوا کرتے تھے۔ حضور نظام کی مصروفیات، گورنر کی دعوتیں اور کبھی کبھی ہفتہ میں ایک دو توصیفی ادارئیے جن کی زبان بڑی غیر معیاری ہوتی

تھی شائع ہوتے تھے۔ قاضی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حیدرآبادی صحافت کو سائنٹفک بنیاد دی۔ چنانچہ پیام کی تقلید میں خصوصی کالم، ادارتی کالم اور تبصرہ وغیرہ عام ہوئے۔ اور مزاحیہ کالم "سرِ راہے" کی مقبولیت نے حیدرآبادی اخباروں کو مزاح کا نیا اور شگفتہ انداز عطا کیا۔

قاضی عبدالغفار بڑے مردم شناس صحافی بھی تھے۔ ان کے اطراف ذہین اور قابل نوجوان جمع تھے اور ان نوجوانوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کی ان میں صلاحیت موجود تھی۔ قاضی صاحب نے جہاں ان نوجوانوں کو صحافت کے اصولوں اور قدروں سے روشناس کرایا وہیں انھوں نے ان کی قابلیت اور جوشِ عمل سے فائدہ اٹھا کر صحافت میں گرمی اور حرارت بھی پیدا کر دی۔ سبط حسین، شہاب الدین، عشرت صدیقی، سری نواس لاہوٹی، شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین، میر حسن، یوسف الدین، گرو چرن داس، شیخ محمد، محمد شبلی یزدانی، احسن علی مرزا، رحیم الدین کمال، اختر حسن اور ادریس مینائی پیام سے وابستہ تھے۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں حیدرآباد کی سیاسی زندگی نے ایک خوش گوار کروٹ لی۔ مطلع صاف ہوا اور سیاہی مائل بہ کرم نظر آئی۔ لیکن یہ صورت حال دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ابر بہت جلد گرد آلود ہو گیا اور مینہ برسا بھی تو اس طرح کہ خس و خاشاک کے ساتھ ایوانوں کے در و دیوار بھی بہہ گئے۔ اس آنے والی تباہی کا قاضی صاحب کو اندازہ تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہم اعتدال پسند پالیسی اختیار کریں۔ خوش گوار تبدیلی یہ آئی کہ لائق علی منسٹری کے بننے سے پہلے سر مرزا اسمٰعیل کو ریاست حیدرآباد کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مرزا اسمٰعیل کی ایما پر قاضی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کو چھوڑ کر محکمہ اطلاعات کی نظامت قبول کیا۔ پھر بھی ان کا تعلق عوام ہی سے تھا۔ یہ سب فروری ۱۹۴۷ء کی باتیں ہیں۔ قاضی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ "پیام" بند ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب اختر حسن صاحب پر پڑی، چنانچہ قاضی صاحب نے انھیں ایک خط لکھا اور اس میں تمام حالات اور "پیام" سے اپنی جذباتی وابستگی کا ذکر کرنے کے بعد انھیں لکھا کہ وہ فوراً حیدرآباد آ کر

"پیام" کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ چنانچہ اختر صاحب ورنگل سے فوراً حیدرآباد آئے اور لکچراری سے استعفیٰ دے کر "پیام" کے ایڈیٹر بن گئے۔ یونس سلیم صاحب ایڈوکیٹ نے درمیانی شخصیت کی حیثیت سے کاروباری معاملہ طے کروایا۔ تین دن کی غیر حاضری کے بعد ۱۴ فیروری ۱۹۴۷ء کو "پیام" کا پھر آغاز ہوا۔

دوشنبہ ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کا اخبار قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت سے نکلنے والا آخری شمارہ تھا۔

چنانچہ تین دن کی "غیر حاضری" کے بعد ۱۴ فروری ۱۹۴۷ء کو جو اخبار شائع ہوا اس اخبار کے ایڈیٹر اختر حسن تھے۔ اسی اخبار کے صفحہ اول پر قاضی صاحب کا مضمون "ترقی پسند مصنفین" بھی شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار کوئی (۱۲) صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں قاضی صاحب کے مضمون کے علاوہ ظفر جاوید اور جمیل الرحمٰن کے مضامین بھی شامل تھے۔ ظفر جاوید اچھے لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ جمیل الرحمٰن ECONOMIC TIMES سے وابستہ ہیں۔ سائنس گریجویٹ ہیں اور جامعہ عثمانیہ ہی کے فارغ التحصیل ہیں۔ "سرِ آغاز" کے زیر عنوان اختر حسن صاحب نے ادارتی نوٹ قلم بند کیا تھا۔ جس میں انھوں نے قاضی صاحب کی خدمات کی ستائش اور مستقبل میں پیام کی پالیسی کی بھی وضاحت کی۔

قاضی صاحب نے صحافت کی جن اعلیٰ قدروں اور پاکیزہ اصولوں کی بنا ڈالی تھی اختر حسن نے آخر وقت تک بنائے رکھا۔ زبان کا ستھرا ذوق اختر صاحب کی نکھری ستھری تحریر کی وجہ سے اور بھی مقبول ہوا۔ قاضی صاحب نے بھی اور اختر صاحب نے اپنی وسیع النظری اور فراغدلی سے صحافت کے سر کو اونچا کیا۔ گو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۷ء کے دوران پیام کو نشیب و فراز سے گذرنا پڑا لیکن ان تبدیلیوں کا کوئی اثر پیام پر اور اس کی پالیسی پہ نہیں پڑا۔ دراصل قاضی صاحب نے پیام کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی۔ اور ان کے اس کارنامے کے پیچھے ان کا ایک طویل تجربہ بھی کارفرما تھا۔ قاضی صاحب پرانے صحافی تھے ان کی تحریر بڑی جاندار ہوتی تھی۔ شروع میں مولانا محمد علی جوہرؔ کے ساتھ "ہمدرد" میں کام

کرتے رہے۔ ہمدرد کے بند ہونے پر جمہور کے نام سے اپنا اخبار کلکتہ سے نکالا۔ جو کئی سال تک نکلتا رہا۔ جب گورنمنٹ نے اسے بند کروادیا تو وہ اپنے وطن مراد آباد چلے آئے۔

قاضی عبدالغفار نے ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد کا رخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں یہاں اخبار "پیام" نکالا۔ جس کے نکالنے میں مولوی عبدالحق نے بڑی مدد کی۔ اس اخبار کی پالیسی سوشلسٹ اصولوں پر مبنی تھی اس لیے اتحاد المسلمین کی سیاست سے اس کی ٹکر ہونے لگی۔ سر مرزا اسمعیل کی وزارت کے زمانہ میں قاضی صاحب پبلسٹی ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ 'پیام' کا اجرا خود قاضی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جسے ہم حیدرآبادی آسانی سے فراموش نہیں کرسکتے۔

سر مرزا اسمعیل کی وزارت کے خاتمہ اور لائق علی وزارت کے قیام نے حیدرآباد کی سیاسی فضا کو ہنگامہ خیز بنا دیا۔ حیدرآبادی سیاست میں تین مختلف گروہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آگئے تھے، ایک تو وہ تھے جو کنگ کوٹھی کے وفادار تھے اور جنھیں بہرحال اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر تھی۔ دوسرا گروہ "اتحاد المسلمین" کے رضاکاروں کا تھا جن کے ہاتھوں میں پرچم آصفی اور زبان پر آزاد حیدرآباد کے ترانے تھے لیکن جو حضور نظام کو صرف مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر قرار دیتے تھے اور تیسرا گروہ ان قوم پرستوں کا تھا جو انڈین نیشنل کانگریس کی بھرپور تائید و حمایت سے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے اور جنھوں نے "ذمہ دارانہ حکومت" کا مطالبہ کیا تھا۔ "پیام" کا تعلق اسی تیسرے گروہ سے تھا۔ اس لئے جب اختر حسن صاحب ایڈیٹر ہوئے تو انہیں دو طرفہ مخالفتوں کا سامنا ہوا۔ حکومت اور اتحاد المسلمین کی نظروں میں پیام کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ اور دوسری طرف قومی تحریک بھی انہیں شاید شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی اس لئے اختر صاحب بھی اور خود قاضی صاحب کمیونزم سے متاثر تھے۔ ظاہر ہے کمیونسٹوں اور کانگریسیوں میں مصالحت ممکن نہیں تھی۔ تاہم پیام کی پالیسی اس حد تک تو واضح تھی کہ وہ حیدرآباد کے انڈین یونین میں شمولیت کا مؤید تھا۔

چنانچہ اختر صاحب کو اس کے نتیجہ میں قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ ایک دن وہ اپنے دفتر

میں بیٹھے تھے کہ ان کے ایک دوست مانک لال صاحب گپتا (جوہری) آئے اور انہیں اپنے ساتھ ان کی رہائش گاہ بنجارہ ہلز چلنے کو کہا۔ جب اختر حسن صاحب وہاں پہنچے تو گپتا صاحب نے انھیں بتایا کہ وہ یہاں نظربند ہیں اور یہاں سے بغیر ان کی اجازت کے کہیں نہیں جاسکتے۔ گپتا صاحب کو معلوم ہو گیا تھا کہ اختر صاحب کو ایک انتہا پسند گروپ قتل کر دینے والا ہے اسی رات ایک مشتعل ہجوم نے "پیام" کے آفس پر دھاوا کیا۔ فائلوں کو آگ لگادی۔ وہاں سے وہ شعیب اللہ خان مرحوم کے اخبار "امروز" کے دفتر پہ پہنچے۔ وہاں بھی انھوں نے وہی کیا اور رات دیر گئے جب شعیب اپنے گھر لوٹ رہے تھے تو گھات میں بیٹھے چند لوگوں نے نہ معلوم وجوہات کی بنا پر ان کا کام تمام کر دیا۔ اس زمانہ میں اختر صاحب ایک مہینہ تک روپوش رہے۔ اور اسی اثنا میں ستمبر ۱۹۴۸ء میں پولیس کارروائی ہوئی۔ اختر صاحب بھی باہر آگئے۔ پولیس کارروائی کے فوراً بعد تمام اردو اخبارات کے ساتھ پیام کی اشاعت بھی مسدود کر دینے کے احکام موصول ہوئے۔ لیکن ایک مہینے کے بعد اخبار پھر جاری ہو گیا۔ حیدرآباد کی فوجی حکومت نے اختر صاحب کو اس شبہ کی بنا پر کہ وہ "آزاد حیدرآباد" میں ہندوستان کے خلاف کام کر رہے تھے، گرفتار کر لیا اور کوئی چار ماہ قید میں رہے۔ رہائی کے بعد اختر صاحب نے پوری توجہ سے اخبار نکالنا شروع کیا۔ یہ دور پیام کی انتہائی ترقی کا دور تھا۔ اس زمانے میں اس کی اشاعت تین ہزار سے بڑھ کر اٹھارہ ہزار یومیہ ہو گئی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں جب پہلے انتخابات منعقد ہوئے تو اختر صاحب نے محاذ کے ٹکٹ پہ جنگاؤں سے الیکشن لڑا اور جیت گئے۔

۱۹۵۳ء میں بی۔ رام کرشنا راؤ وزارت میں اختر صاحب کو طلباء کے ملکی احتجاج کی تائید میں پیام کا اداریہ لکھنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ اب کی بار وہ پانچ ماہ جیل میں رہے۔ لیکن پیام برابر نکلتا رہا۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں احسن علی مرزا، ریاست خانم شامل تھے۔ اب پیام کے مالی حالات خراب ہو رہے تھے۔ اس لئے اختر صاحب نے اس کا بورڈ آف ڈائریکٹرس بنا دیا اور ملکیت اس بورڈ کے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ارکان کے باہمی اختلافات کی وجہ

سے یہ اسکیم نہ چل سکی اور دی کے ڈھگے صاحب نے جو بورڈ کے ایک رکن تھے، کامریڈ جے سوریہ نائیڈو کے ساتھ اپنا الگ پیام نکالنا شروع کیا۔ چار دن تک دو "پیام" شائع ہوتے رہے۔ بعد میں اختر صاحب نے "عوام" کا اجازت نامہ حاصل کیا اور "عوام" نکالنے لگے۔ پندرہ دن کے بعد جے سوریہ نائیڈو کا پیام بند ہو گیا۔ اختر صاحب نے دوبارہ "پیام" کا ڈیکلریشن حاصل کیا۔

۱۹۵۶ء کے عام انتخابات میں اختر صاحب نے شہر حیدرآباد سے محترمہ معصوم بیگم (کانگریس) کے مقابلہ میں مقابلہ کیا اور ناکام ہو گئے۔ اس کے علاوہ مسلسل خسارہ کی وجہ سے ۱۹۵۷ء میں پیام ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس آخری دور میں لطیف ساجد ادارۂ پیام سے وابستہ ہو گئے تھے اور قابلِ ذکر بات یہ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ خفیہ پناہ گاہ سے پیام کے لیے اداریہ لکھا کرتے تھے۔

رعیت

یم نرسنگ راؤ نے ۱۹۲۷ء سے اخبار نویسی شروع کی۔ اور "رعیت" جاری ہوا۔ صلا
رعیت ابتداً ہفتہ وار اخبار تھا۔ پنڈت نریندرجی شریک کار تھے۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ رعیت کی مسدودی تک شری بشیر احمد طاہر اس اخبار سے وابستہ رہے۔ بشیر احمد طاہر صاحب بعد میں آئی۔ اے۔ ایس عہدہ دار ہوئے اور آندھرا پردیش کے قیام کے بعد کلکٹر کے عہدے پر فائیز ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ رعیت کے قلمی معاونین میں شری فضل الرحمن، حسن الدین اور رحیم الدین کمال بھی اس اخبار میں کثرت سے لکھتے رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں رعیت (ہفتہ وار) کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں رعیت ہفتہ وار روزنامہ میں تبدیل ہوا پھر اکٹوبر ۱۹۴۷ء میں حکومت نے اس کو مکرر بند کر دیا۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک تقریباً دس سال کا یہ دور "رعیت" کی زندگی کا بھی اور حیدرآباد کی سیاست کا بڑا پیچیدہ، غیر یقینی اور افراتفری کا رہا ہے۔ اس زمانہ میں وہ تمام حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجے میں ریاست حیدرآباد کی خود مختارانہ حیثیت ختم ہو گئی اور وہ اس سے بھی کئی گنا بڑی آزاد، سیکولر اور جمہوری ملک کا جزو بن گیا۔ دوسری مرتبہ اکٹوبر ۱۹۴۷ء میں رعیت کی مسدودی کی وجہ عیاں ہے۔ ۱۵ اگسٹ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ حضور نظام نے ریاست حیدرآباد کی آزادی کا الگ اعلان کیا۔ رعیت کی یہ پالیسی تھی کہ

صلا یم نرسنگ راؤ کے بارے میں تفصیلی خاکہ "میرا شہر میرے لوگ" میں شامل ہے۔

ریاست انڈین یونین میں ضم ہوجائے۔ یہ خود اس وقت کی گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف بات تھی۔ اس لیے حکومت نے 'رعیت' کو بند کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔

یم نرسنگ راؤ صاحب کے پیش نظر غالباً نپولین کا یہ قول رہا ہو کہ ہزار سنگینوں سے زیادہ مخالف اخباروں سے ڈرنا چاہیے۔ دکن میں قومی تحریک کے کاز کو آگے بڑھانے' ریاست کے ذی شعور اور ذی ہوش افراد کو متحد کرنے اور اُن کے سینوں کو جذبۂ آزادی سے سرشار کرنے کے لیے انہوں نے صحافت کا سہارا لیا۔ رعیت کی اجرائی نے گویا اسٹیٹ کانگریس کو نطق عطا کیا۔ اس کے ذریعہ کانگریس اپنے خیالات و افکار عوام تک پہنچانے لگی اور اس طرح اس تحریک کو کافی بڑھاوا ملا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر "رعیت" کا سارا رجحان سیاسی ہی تھا اور نرسنگ راؤ زبان و بیان کی طرف کم ہی توجہ دیتے تھے۔ اس لیے "رعیت" اس حیثیت سے مقبول اخبار نہیں تھا۔ اسکے برخلاف صحیفہ، پیام، رہبرِ دکن، نظام گزٹ اور صبحِ دکن کی وجہ سے صحافتی زبان کا ایک خاص معیار بن گیا تھا۔ سرخیاں لگانے اور خبروں کو جاری کرنے کا بھی ایک ڈھنگ بن گیا تھا۔ سٹنگ اور ایڈیٹنگ کے لحاظ سے "رعیت" بہت پیچھے تھا۔ ایک خبر یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس خبر سے آپ بھی کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں:

جوار...!

ارزاں ہوئی مگر گراں ہے

حیدرآباد یکم خورداد۔ جوار بازار میں دو روز پہلے روپیہ کو (۴) سیر مل رہی تھی دو روز سے بازار میں (۵) سیر مل رہی ہے۔ آج سے سرکاری دوکانوں پہ (۵/۱) سیر ملا کرے گی اور چاول (۴) سیر۔

نئے انتظامات کے مطابق سرکاری دوکانوں کو مال آج سے حیدرآباد کمرشیل کارپوریشن کے زیرِ انتظام مل رہا ہے۔ (دکن نیوز) جلد ۲ ۷ / اپریل ۱۹۴۳ء

ایک دوسری خبر سے آج کی مہنگائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بازاری نرخ

سونا فی تولہ ... ۸۹ روپیہ (حالی) چاندی فی صد تولہ ... ۱۳۲ روپیہ (حالی)

یم نرسنگ راؤ وسیع النظر اور فراغ دل صحافی تھے۔ بہادر خانؒ یقیناً مخالف تنظیم اتحاد المسلمین سے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ اس کے بانی مبانی بھی تھے لیکن وہ ان کے اچھے دوست بھی تھے چنانچہ شاہِ وقت کی ایماء پر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے سلسلہ میں ان دونوں قائدین کی ایک سے زیادہ بار گفتگو بھی رہی۔ وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ قائدِ ملت کی موت نے یم نرسنگ راؤ کو خون کے آنسو رُلایا تھا۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان کی شہادت کچھ عجیب و غریب انداز میں واقع ہوئی تھی۔ ۲۶ر جون کی رات ۱۱ بجے میر ہاشم علی خان رکن عدالت العالیہ کے یہاں دعوت میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے اور حقہ پینے کے دوران ان کی روح پرواز کر گئی! سارے شہر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس میں 'رعیت' بھی برابر کا شریک رہا۔ یہ یم نرسنگ راؤ صاحب کی انسان دوستی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے ۲۸ر جون ۱۹۴۴ء کے اداریہ میں لکھا ہے:

"قائدِ ملت نے اپنی قیادت کے چند ہی سالوں کے اندر ایک بڑا کام یہ کیا کہ آپ نے مسلمانانِ حیدر آباد میں ایک عام سیاسی شعور پیدا کیا۔ گو قائدِ ملت کے سیاسی نظریوں اور سیاسی مسلک سے ہم کو ہمیشہ سخت اختلاف رہا لیکن ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قائدِ ملت نے مسلمانانِ حیدر آباد کو جگایا اور ان میں ایک زبردست ملی اور مدنی احساس پیدا کر دیا ...

اس کو قائدِ ملت کی خدمات کی بدولت ہی سمجھنا چاہیئے کہ سارے حیدر آبادیوں میں آزادی کی ایک اُمنگ پیدا ہو گئی ..... یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ قائدِ ملت نے حیدر آبادیوں کے دلوں سے وہ خوف اور وہ ڈر نکال دیا جو آزادی کا نام لینے میں حائل تھا۔"

اس تحریر سے جہاں قائدِ ملت کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے وہیں ایک مخلص

اور سچے انسان کی حق گوئی، صداقت پسندی اور وسیع النظری بھی عیاں ہوتی ہے "رعیت" نے بے ریائی، سچائی، اخلاص اور وسیع النظری کی یہ جو روایت ڈالی ہے وہ تاریخ صحافت میں بجائے خود بڑا کارنامہ ہے۔

"ہندوستان کا مستقبل اور حیدرآباد" اور "مسلم لیگ کی تیسویں میقات" کے زیر عنوان ایم نرسنگ راؤ نے جو اداریئے مختلف اقساط میں لکھے ہیں وہ ہماری جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کے اہم ابواب ہیں۔

روزنامہ "رعیت" میں ایم نرسنگ راؤ صاحب کے ساتھ کام کرنے والوں میں شری بی۔ ایس راؤ، شری ایم گوپال کرشن راؤ اور شری جلال الدین شامل تھے۔ اس زمانہ میں ورکنگ جرنلسٹ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جرنلزم یا اخبار نویسی پیشہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے صحافت میں ٹریڈ یونین ازم کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ جن لوگوں نے رعیت میں کام کیا ہے انھوں نے محض خدمت کے خاطر کیا ہے کھانے کے لیے نہیں۔ علاوہ ازیں اس قوم پرست اخبار کی نواب سالار جنگ مرحوم، اور کمال یار جنگ مرحوم نے چندوں اور عطیوں کے ذریعہ سے مدد کی۔ نواب مہدی نواز جنگ مرحوم راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی آنجہانی (کوتوال بلدہ کے عہدے سے ہٹنے کے بعد) اور رائے سری کشن بیرسٹر ایٹ لا بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو "رعیت" ہفتہ وار کے دور میں قلمے، قدمے درمے ہمیشہ مدد کرتے رہے۔ جسٹس کیشو راؤ آنجہانی نے اپنے مطبع دکن لا رپورٹ میں "رعیت" کی طباعت کا انتظام کیا تھا۔ یہ ساری سہولتیں "رعیت" کو ملیں جس کی وجہ سے تقریباً دس سال تک وہ اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی کامیاب جدوجہد کرتا رہا۔ جب ۱۹۴۷ء میں "رعیت" بند ہوگیا تو اس میں کام کرنے والے صحافی بھی منتشر ہوگئے۔ بی ایس راؤ ان دنوں زراعت کر رہے ہیں۔ گوپال کرشن راؤ صاحب بورڈ آف ریونیو میں اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ اور جلال الدین صاحب اپنے خانگی کاروبار میں مصروف ہیں۔ روزنامہ "رعیت" کی مسدودی کے کوئی دو تین سال قبل بی ایس راؤ اور جلال الدین صاحب اپنا ہفتہ وار "رہنما" جاری کرنے کیلئے ادارہ سے الگ ہوگئے تھے۔ اسی وقت شری شعیب اللہ خان

مرحوم نرسنگ راؤ صاحب کے شریک کار ہو گئے اور "رعیت" کی مسدودی کی آخری گھڑی تک انھوں نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ "رعیت" کی مسدودی کا حکم دیکھنے کے بعد شعیب اللہ کو بے حد رنج ہوا۔ اور انھوں نے اپنا اخبار "امروز" جاری کیا۔ دراصل امروز رعیت ہی کا تسلسل تھا۔ ■

میزان

روزنامہ "میزان" ۱۹۴۳ء میں حبیب اللہ اوج کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا۔ غلام محمد کلکتہ وال جو احمد علاء الدین کے داماد تھے اس اخبار کے مالک تھے۔ غلام محمد کروڑپتی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کلکتہ میں ان کی کاغذ کی تجارت تھی۔ وہ تاجر تو تھے لیکن انھیں ادب اور خصوصاً صحافت سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وہ ٹھوس اور مستقل بنیاد پر اخبار جاری کرنے کے قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے تقریباً چھ ماہ تک کم تعداد میں اپنے احباب اور رشتہ داروں کے لیے نکالتے رہے لیکن جو لوگ اس اخبار میں کام کرتے تھے انھیں پوری تنخواہیں مل جاتی تھیں۔ حیدرآباد کی صحافتی تاریخ کا یہ پہلا اور عجیب و غریب تجربہ تھا۔ لیکن غلام محمد کی فراغ دلی نے اس تجربہ کو کامیاب اور مثالی بنایا۔ جب انھیں اپنے کام پر اطمینان ہوا تو اس اخبار کو عام لوگوں تک پہنچایا جانے لگا۔ مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کے لیے وہ مشہور تھے۔ خدا نے انھیں ذہانت، دولت، اور صحت کے ساتھ ساتھ خدمت کا جذبہ بھی عطا کیا تھا۔ وہ بہت بذلہ سنج اور زندہ دل صحافی تھے۔ انھیں بچوں سے بے حد پیار تھا اس لیے جب "میزان" مقبول ہوا تو اس میں بچوں کے لیے بھی ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک صفحہ مختص کر دیا گیا اور بچوں کی لیگ بھی بنائی گئی۔ لیگ کا بیاج بھی ہوا کرتا تھا۔ جسے وہ خود بھی لگاتے تھے۔ بچوں کی ذہنی اور تحریری و تقریری صلاحیتوں کو ابھارنے اُجاگر کرنے کے لیے انھوں نے تحریری و تقریری مقابلوں کو منعقد کروایا۔ لیگ کی مختلف شہروں میں شاخیں بھی تھیں جہاں ماہانہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان کی رپورٹیں "میزان" میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ "بچوں کا صفحہ" کی ترتیب کا کام اطہر افسر اور شمس اصغر انجام دیا کرتے

تھے۔ ایڈیشن کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر زور، زینت ساجدہ، جہاں بانو نقوی، وحیدہ نسیم، نصیر الدین ہاشمی، عاتق شاہ اور قمر ساحری اور "بچوں کا صفحہ" کے لکھنے والوں میں صبیحہ تسنیم، سلیمہ رزاقی، شمیم انصاری، عفت موہانی، وقار خلیل، مصلح الدین احمد اور حامد الدین محمود قابلِ ذکر ہیں۔

روزنامہ "میزان" حیدرآباد کی صحافتی تاریخ میں اس وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بیک وقت تین زبانوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس نوعیت کا یہ حیدرآباد سے نکلنے والا پہلا اور واحد اخبار تھا۔ اردو میزان کے مدیر جامعہ عثمانیہ کے ممتاز سپوت حبیب اللہ اوج تھے۔ تلگو میزان اردی بابو راجو اور انگریزی میزان مرزا عابد بیگ کی ادارت میں جاری ہوئے تھے۔

حبیب اللہ اوج جامعہ عثمانیہ کے ہونہار فرزند تھے۔ جس طرح وقار احمد، حبیب اللہ رشدی، شعیب اللہ، بدر شکیب، میر حسن، مخدوم، اکبر وفاقانی، عبدالرحمٰن رئیس، عظیم الدین مجت، اشک، جلیس، صاحبزادہ میکش، اختر حسن وغیرہ نے جامعہ عثمانیہ سے نکلنے کے بعد صحافتی میدان میں قدم رکھا اور صحافت و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں اس طرح حبیب اللہ اوج نے بھی اپنی ذہانت، قابلیت، دلچسپی اور محنت سے حیدرآبادی اردو صحافت کو نیا آہنگ، نیا لہجہ اور توازن عطا کیا، اور نئی زبان بھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کی زبان دکنی تھی، جامعہ کے قیام کے بعد بول چال کی زبان ادبی زبان سے قریب تر ہوتی گئی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح صحافت میں بھی عثمانین کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ روزنامے، ہفتہ وار اور ماہ نامہ کثرت سے نکالے گئے۔ عثمانیہ کے قیام کے بعد بہت سے شاعر، ادیب پیدا ہوئے جن کی تخلیقات اور منظومات روزناموں اور ماہ ناموں میں شائع ہونے لگے۔ ہمارے اخباروں کی زبان، لہجہ اور معیار اس کی وجہ سے بہتر ہوتا گیا۔ اور بہت جلد ہندوستان کے دیگر اخباروں سے مختلف اور کہیں زیادہ شائستہ بھی ہوتا تھا۔ شمالی ہند کے اخبار کی ایک سرخی ملاحظہ ہو:

"لاہور میں جوتا چل گیا"

اس طرح کا لہجہ اور زبان ہمارے اخباروں میں استعمال میں نہ آتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ شمالی ہند میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی تھی جبکہ اس کا شائبہ بھی یہاں موجود نہ تھا۔ بہرحال حیدرآبادی اخباروں کی اس شائستگی اور پاکیزگی کو بنائے رکھنے میں "میزان" بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ حبیب اللہ اوج اور ان کے ساتھی حسن الدین عثمانی، صفی اللہ شمس اصغر نے اس معیار کو بنانے میں اہم حصہ ادا کیا ہے حبیب اللہ اوج خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ اچھی خاصی تنخواہ پانے کے باوجود سادگی پسند تھے۔ قلم بر داشتہ لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ "سنا ہے آپ نے" ان کا مشہور مزاحیہ کالم تھا۔ ناکارہ حیدرآبادی کے بعد جن مزاح نگاروں نے نام پیدا کیا ان میں حبیب اللہ اوج کا نام نمایاں ہے۔ "میزان" کے ہفتہ وار ایڈیشن میں "ہاں! میری چشم گناہگار نے یہ بھی دیکھا" ان ہی کے زورِ قلم کا رہنِ منت ہے۔ ۱۹۴۹ء جنوری میں جب "میزان" بند ہوگیا تو غلام محمد اور اوج پاکستان چلے گئے۔ غلام محمد تجارتی کاروبار میں مصروف رہے اور ان کا انتقال ماہ ڈسمبر ۱۹۷۲ء بمقام کراچی ہوا۔ اس سانحہ کی اطلاع سے حیدرآباد کے اکثر صحافیوں اور عوام کو سوگوار کیا۔ حبیب اللہ اوج "نوائے وقت" اور "احسان" کے بعد "آفاق" کے مدیر بنے۔ اس کے بعد پھر وہ "نوائے وقت" سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے پاکستان کی صحافت میں اپنا خاص مقام پیدا کیا۔ حیدرآباد سے پاکستان ہجرت کرنے والے صحافیوں میں حکیم انصاری، ایوب احمد کرمانی کے بعد اوج اور ابراہیم جلیس نے محض قابلیت، جوشِ عمل اور ذاتی صلاحیت سے اپنے ملک کی روایات کو برقرار رکھا۔ حبیب اللہ اوج حکومتِ امریکہ کی دعوت پر امریکہ کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔

"میزان" کی پالیسی اتحاد، اخوت اور مساوات پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ یہ آزاد حیدرآباد کا قائل تھا۔ لیکن بے باک اظہارِ رائے کے لیے بھی مشہور تھا چنانچہ حکومت نے اس پر پابندی بھی عائد کی تھی جس کی ضمانت کے لیے جب چندہ کیا گیا تو ضرورت سے زیادہ رقم جمع ہوگئی اور چندہ نہ دینے کی اپیل کرنی پڑی۔ اس واقعہ سے "میزان" کی عوام میں بے پناہ

ہر دل عزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ ویسے بھی "میزان" اپنے وقت کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار بھی تھا۔ اس کی اشاعت تقریباً ۱۹، ۲۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

"میزان" کی دوسری خصوصیت اس کی سائز تھی۔ یہ ڈبل ڈمی سائز پہ چھپتا تھا۔ کاغذ کی دشواری کے باوجود "میزان" اپنی اس خصوصیت کو آخری وقت تک بنائے رکھا۔ ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلیوں کا اثر اس اخبار پر بھی پڑا۔ اور بالآخر جنوری ۱۹۴۹ء میں "میزان" بند ہو گیا اور اس اخبار کا پورا اسٹاف روزنامہ "آواز" میں منتقل ہو گیا۔ یہ اخبار اورینٹ نیوز سروس جس کے مالک عبد القادر تھے کی نگرانی میں جاری ہوا اور ۱۹۵۰ء میں اس کی مسدودی عمل میں آئی۔ غلام محمد اور اوج پاکستان منتقل ہو گئے اور اظہر افسر نے "آواز" کے بند ہونے کے بعد اسی سال ۱۹۵۰ء میں بچوں کا رسالہ "بچوں کی دنیا" جاری کیا۔ یہ بچوں کا پہلا رسالہ تھا جو مختلف رنگوں میں چھپتا تھا۔ اظہر افسر کے ساتھ میکش بھی کام کرتے تھے۔

"میزان" کو بند ہوئے عرصہ ہوا لیکن لوگ آج بھی "سنا ہے آپ نے" اور ہاں میری چشم گناہ گار نے یہ بھی دیکھا" جیسے طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ■

امروز

شعیب اللہ خان کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے اُس وقت کے حیدرآباد کو سمجھنا بے حد ضروری ہے جو ایک مطلق العنان بادشاہ کے زیرِ نگیں تھا لیکن یہ مطلق العنان بادشاہ خود اپنی رعایا کے ایک مختصر سے طبقہ کے دباؤ میں تھا۔ اتحاد المسلمین کا دوسرا دور عقلی دیوالیہ پن کا دور تھا۔ جذباتی نعرے بلند ہو رہے تھے۔ آزاد اور ایک خود مختار ریاست کا خوابِ رنگیں دیکھا جا رہا تھا۔ شاہ عثمان بلاشبہ سیاسی اقتدار کے مظہر ضرور تھے لیکن یہ اقتدار مسلمانوں کے ایک طبقہ کا تھا۔ تا ابد شاہ عثمان کی حیات کے ترانے گائے جا رہے تھے اور دوسری طرف جذباتی لیڈرشپ ریاست میں ہیجان اور انتشار پیدا کر رہی تھی ایسے میں اسٹیٹ کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اور ساتھ ہی سوامی رامانند تیرتھ بورگل بلارام کشن راؤ، ایم نرسنگ کی کوششوں سے صحافت میں قومی رجحان بھی پیدا ہو چلا تھا۔ بعد کو ایم نرسنگ راؤ نے خود بھی "رعیت" کے ذریعہ قوم پرستانہ افکار و خیالات کو عام کرنا شروع کیا۔ آزاد حیدرآباد کی تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے ہندوستان کا مستقبل اور حیدرآباد کے موضوع پر اداریے لکھے گئے۔ اور خود بھی بحیثیت سیاسی لیڈر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لیا۔

شعیب اللہ خان ۱۲ر اکٹوبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے اور انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی۔ جامعہ کے قیام سے قبل حیدرآباد کی زبان دکنی تھی۔ جامعہ کے قیام کے بعد بول چال کی زبان ادبی زبان سے قریب تر ہوتی گئی۔ عثمانین ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے مضامین،

نظمیں اخباروں، ہفتہ واروں اور ماہ ناموں میں شائع ہونے لگے۔ اور اس کے نتیجہ میں صحافت کی زبان نکھر ستھر کر مرصع ہوتی گئی۔ علاوہ ازیں اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بعض روشن خیال، فراغدل اور وسیع النظر صحافی بھی پیدا ہوئے۔ ان ہی صحافیوں میں شعیب اللہ خان بھی شامل ہیں۔ جب انھوں نے گریجویشن کیا تو دیگر احباب کی طرح صحافت کا رُخ کیا چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے ایک ہفتہ وار "تاج" جاری کیا۔ لیکن یہ ہفتہ وار زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا۔ شعیب نے اس ہفتہ وار کے ذریعہ اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں پر تنقید کی تھی۔ اخبار پر امتناع عائد کر دیئے جانے کے بعد وہ 'رعیت' سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن جب اس پر بھی پابندی عائد ہوئی تو انھوں نے بی رام کشن راؤ اور دیگر دوستوں کی مدد سے اپنا ذاتی اخبار "امروز" جاری کیا۔ اب ان کے قلم میں زیادہ تیزی بھی اور تلخی پیدا ہو چکی تھی لیکن شعیب اللہ خان کے قتل کے بعد "امروز" بھی بند ہوگیا۔ ■

رہنمائے دکن

۱۹۴۸ء میں ریاست حیدرآباد کی سیاسی تبدیلی کے دُور رس اثرات ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہو رہے تھے۔ ہر طرف دہشت و مایوسی کا عالم طاری تھا۔ رہبر دکن کی پھر اجرائی ناممکن اور محال تھی کہ فوجی حکومت کی نظروں میں یہ معتوب قرار پا چکا تھا۔ بعد غور و خوض کے جناب منظور حسن انصاری کے زیر ادارت روزنامہ رہنمائے دکن کی اشاعت کے لیے فوجی حکومت سے درخواست کی گئی تھی جو چند ماہ بعد منظور ہو گئی کہ یہ ایک نیا روزنامہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲؍ جولائی ۱۹۴۹ء کو اس انداز سے شائع ہوا کہ لوگوں کو پہلی نظر میں رہبر دکن کا دھوکہ ہوا۔ ظاہری وضع قطع وہی خبروں کی ترتیب وہی اور مستقل عنوانات بھی وہی حتیٰ ایں کہ کتابت و طباعت میں بھی کچھ فرق نہیں تھا، دوسرے معنوں میں یہ رہبر دکن کا مثنیٰ تھا۔

اس کی مجلس ادارت میں ابتداً جناب سید محمود وحیدالدین کے علاوہ شفیع الدین ناکارہ حیدرآبادی، شبلی یزدانی، عبدالقادر جیلانی اور حبیب محسن شریک تھے آگے چل کر نورالمصطفیٰ سید محمد علی، یوسف الدین، معبدالحق، ظفر عالمگیر، ضیاء الحق وغیرہ شریک ادارت ہوئے۔ چند رسری واستو، عابد صدیقی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید بھی ادارہ رہنمائے دکن سے وابستہ رہے۔ ان دنوں افضل خان، غضنفر علی خان، ضیاء الحق، عبدالقادر جیلانی اور حبیب محسن مجلس ادارت سے وابستہ ہیں

شفیع الدین ناکارہ نے اردو ادب میں مزاح نگار کی حیثیت سے نام کمایا۔ جبکہ شبلی یزدانی، عبدالقادر جیلانی اور حبیب محسن سنجیدہ قلمکار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ "رفتار سیاست" کے لیے ظفر عالمگیر اور سلیمان اطہر جاوید یکے بعد دیگرے لکھتے رہے۔ ظفر عالمگیر افسانہ نگاری کے لیے

اُردو کے ادبی حلقوں میں مشہور تھے جب وہ پاکستان منتقل ہوئے تو سلیمان اطہر جاوید کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اردو صحافت میں چند سری واستو جذباتی اندازِ فکر کی وجہ سے مشہور ہوئے اُردو کے مسائل کے حل کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو کسی بھی جمہوری حکومت کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ وہ عرصۂ دراز تک بھارت نیوز سروس سے بھی وابستہ رہے ہے۔ انجمن تحفظ اُردو کے تحت انھوں نے قومی زبان (۱۹۶۳ء) بھی جاری کیا تھا جس کا اردو کانفرنس نمبر کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان دنوں آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے سکریٹری / ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں حسن فرخ اُردو کے جدید شاعر ہیں ان دنوں رہنما سے وابستہ ہیں۔

"رہنمائے دکن" کے ہفتہ وار ایڈیشن میں "بچوں کا صفحہ" بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ "ہماری لیگ" میں حیدر آباد کے ہزاروں نوعمر ادیب ممبر بن گئے۔ اس صفحہ نے حیدر آبادی نوجوانوں میں ادبی ذوق کو پیدا کرنے اور ان کی تحریری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان دنوں "بچوں کے صفحہ" کی جگہ نوجوانوں کے صفحہ نے لے لی ہے۔

ابتدائی زمانہ میں ادارہ نویسی کے فرائض محمود وحید الدین اور شفیع الدین انجام دیتے ہے البتہ مذہبی اداریئے اور مضامین شبلی یزدانی لکھتے رہے۔

رہنمائے دکن کی اشاعت کو چند مہینے بھی نہیں ہوئے تھے میر لائق علی نظر بند ہو گئے صدر اعظم دولت آصفیہ حکومت کی نظر بندی سے کسی طرح بچ نکلے اور خفیہ طور پہ کراچی پہنچ گئے۔ اس سلسلہ میں ان کے اعزہ واقربا کی گرفتاریاں ہوئیں ان میں سید محمود وحید الدین، ایڈیٹر رہنمائے دکن بھی تھے یہ دور رہنمائے دکن کے لیے بڑا ہی صبر آزما اور نازک دور تھا حالات کی خطرناکی کو دیکھتے ہوئے شفیع الدین نے اداریے لکھنے سے احتراز کیا اور یہ ذمہ داری شبلی یزدانی کے سر ڈالی گئی جنھوں نے کمال احتیاط کے ساتھ یہ ذمہ داری محمود وحید الدین کی رہائی تک پوری کی۔

رہنمائے دکن نے ہفتہ وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول و مشہور ہوا۔ اس کا مذہبی صفحہ اور رفتارِ سیاست، بچوں کا صفحہ اور اس کے دیگر مضامین پسند کیے جانے

لگے۔ اس کے علاوہ عیدین، جشنِ آزادی اور یوم جمہوریہ کی خصوصی اشاعتیں بہت مقبول عام ہوئیں۔ مذہبی مسائل پہ رہنمائے دکن کے اداریہ بہت موثر ہوتے تھے۔ حضور نظام جامعہ نظامیہ میں اپنے استاذ بانی جامعہ نواب فضیلت جنگ کی قد آدم تصویر آویزاں کرنا چاہتے تھے عین اس دن جبکہ یہ تقریب منعقد ہونے والی تھی رہنمائے دکن نے اس کے عدم جواز پہ ایک شذرہ لکھا جس کو دیکھ کر حضور نظام نے اپنی رائے بدل دی حالانکہ اس کی مخالفت علمائے دکن کی جانب سے ہونی چاہیئے۔ اسی طرح رہنمائے دکن اکثر مقامی اور کل ہند مذہبی و غیر مذہبی و سیاسی مسائل پہ اداریہ لکھے اور مفید و معلومات افزا مضامین شائع کیے۔

غالباً ۱۹۶۵ء میں سید محمود وحید الدین رہنمائے دکن ادارت اور اس کی ملکیت سے دستبردار ہو گئے اور اخبار سید لطیف الدین قادری اور ان کے برادرِ خورد سید وقار الدین کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔ عملہ ادارت میں آگے چل کر وقفہ وقفہ سے بہت تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ان دونوں حضرات نے اخبار کو ترقی دینے اور اس کی اشاعت بڑھانے کی بہت کوشش کی۔ بعض خصوصی مواقع پر خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا جو بہت مقبول ہوئیں ان میں قرآن نمبر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ رہنمائے دکن کو آفسٹ پریس پہ شائع کر کے اس کی ترقی کی راہیں ہموار کی گئیں۔ ایک مدت تک رہنمائے دکن مقامی سیاست میں کوئی حصہ لیتا تھا نہ اس کے ایڈیٹر کسی ادارہ سے وابستہ تھے۔ اب یہ روایت باقی نہیں رہی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ہفتہ وار اشاعت میں مذہبیات کیلئے ایک صفحہ مختص ضرور رہتا ہے لیکن ان مسائل میں جو مذہبی نقطۂ نظر سے متنازعہ فیہ ہوتے ہیں، عوام کی بروقت اور صحیح رہنمائی کرنے کی بہرحال ضرورت ہے۔ عرب ممالک کی تائید و حمایت میں رہنمائے دکن پیش پیش ہے۔ بیشتر عرب ممالک کے تعلق سے معلومات افزا مضامین اور خبریں شائع ہوتی ہیں حال ہی مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس مراقش میں منعقد ہوئی۔ اس میں وقار الدین صاحب کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ فی الجملہ رہنمائے دکن" حیدرآباد کے معیاری اخبارات میں شمار ہوتا ہے۔

ملاپ

حیدرآباد سے شائع ہونے والے روزناموں میں "ملاپ" کو کئی حیثیتوں سے اہمیت بھی اور انفرادیت حاصل ہے گو حیدرآباد سے یہ ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا لیکن بیساکھی کے دن ڈش حال چند جی نے اخبار ملاپ کا ۱۹۲۳ء کو اجرا کیا۔ ملاپ ہندوستان کے دو بڑے شہروں دلی اور جالندھر سے بہت پہلے سے جاری تھا۔ اس طرح "ملاپ" اب ملک کے تین اہم مراکز سے ایک ساتھ شائع ہونے لگا تھا اس کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ بیک وقت یہ دو زبانوں اردو اور ہندی میں شائع ہوتا ہے بلا شبہ حیدرآباد میں اس کی روایت "میزان" سے شروع ہو چکی تھی لیکن موجودہ اخباروں میں ایسا کوئی بھی اخبار نہیں ہے جو بیک وقت ایک سے زائد مقامات سے اور ایک سے زائد زبانوں میں شائع ہوتا ہو۔ اب تو روزنامہ ملاپ نے اپنا ہفتہ وار ایڈیشن اردو زبان میں لندن سے بھی شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۴ رجولائی ۱۹۷۲ء کو شائع ہوا جو اپنے گٹ اپ، تنوع، سٹنگ اور طباعت کے لحاظ سے ایک منفرد مقام کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ اس ہفتہ وار میں رنبیر جی کے اداریہ، فکر تونسوی کے پیاز کے چھلکے اور "ملاپ" کے دیگر مستقل کالم شریک ہیں۔ علاوہ ازیں چند نئے کالم بھی ہیں۔ چنانچہ برطانیہ میں جو اردو داں انگریز موجود ہیں ان کا تعارفی سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ "ملاپ" نے روایتی رواداری کو باقی بھی اور برقرار رکھتے ہوئے برطانیہ میں مقیم پاکستانی باشندوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی خبروں کے لیے ایک صفحہ مختص کر دیا گیا۔

لندن ایڈیشن میں ادبی صفحہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ چند افراد نے لندن میں کل برطانیہ انجمن ترقی اردو بھی قائم کی ہے۔ جس کے صدر راجہ صاحب محمود آباد منتخب ہوئے ہیں اور ایک انگریز رسل اس کے نائب صدر ہیں۔ اس انجمن کی سرگرمیوں کی تفصیلات ملاپ نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں۔

چوں کہ اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر "ملاپ" حیدرآباد کے ایڈیٹر شری یدھ ویر جی ہیں۔ اس لیے قدرے تفصیلی لندن ایڈیشن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ویسے دلچسپی اور معلومات کی خاطر ملاپ کے لندن ایڈیشن کا تذکرہ غیر ضروری بھی نہیں ہے۔

"ملاپ" کے چیف ایڈیٹر رنبیر جی ہیں اور حیدرآباد سے نکلنے والے "ملاپ" کی ادارت کی ذمہ داری یدھ ویر جی کے سر ہے۔ یدھ ویر جی شریف الطبع اور مخلص آدمی ہیں انھوں نے اردو زبان کے مسئلہ کی پیش کشی میں اور فسادات کے بارے میں جو اداریئے لکھے ہیں صحافتی تاریخ میں ان کی روشن ضمیری اور بے باکی کی مثال بن کر رہیں گے

حیدرآباد کے دیگر اہم اخباروں کی طرح ملاپ میں "ادبی صفحہ" ہمیشہ ہی سے شامل رہا ہے۔ جس زمانہ میں بچوں کے لیے صفحہ ہر اخبار میں مختص ہوا کرتے تھے اس زمانہ میں ملاپ نے بھی بچوں کا صفحہ "بال سبھا" کے نام سے شائع کیا اور اس کو وقار خلیل ترتیب دیا کرتے تھے۔ حبیب علاءالدین کے بعد اب وقار خلیل ادبی ایڈیشن ترتیب دے رہے ہیں۔ ولی اللہ حسینی بخاری عرصہ دراز تک ملاپ سے وابستہ رہے۔ حیدرآبادی صحافیوں میں اپنی سنجیدگی اور شرافت کی وجہ سے مشہور تھے۔ سیاسی اور ادبی جھمیلوں سے ہمیشہ دور رہے جس کی وجہ سے صحافت سے ہٹ کر بہت کم جانے پہچانے جاتے تھے۔ اخبار سے علیحدگی اختیار کر کے امریکہ چلے گئے۔ جہاں ان کا انتقال ہو گیا حبیب علاءالدین اردو کے سلجھے ہوئے صحافی ہیں۔ وہ عرصۂ دراز تک ملاپ سے وابستہ رہنے کے بعد علیحدگی اختیار کی دسیم اختر ان دنوں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں لیکن ملاپ کے سینئر صحافی کی حیثیت سے

کافی نام پیدا کیا ہے۔ شاہد عظیم ---------------------

اور احسن علی، مرزا بھی اس اخبار سے وابستہ تھے۔ ان ممتاز صحافیوں کے علاوہ ملاپ سے ہاشم سعید، لعمانی صاحب، خسرو انصاری، اعجاز قریشی (ایڈیٹر بھارت نیوز) رحمت علی (موجودہ ایم پی) (راجیہ سبھا) مہدی عابدی، جہاں دار افسر، معراج الدین محمد شفیع احمد، عبدالغفار اور رشید الدین بھی وابستہ رہے ہیں۔

سیاست

اعلیٰ صحافت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انسانی اور عالمی اقدارِ حیات کی ترجمانی کرے۔ امن و سلامتی کا چرچا ہو، بھائی چارگی اور انسانی وحدت کا تصور عام ہو اور معاشی، سماجی اور اخلاقی مساوات و انصاف کی فضا بنائے رکھے۔ اس مقصد کے لیے روزنامہ "پیام" غنیمت اخبار تھا۔ لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد کچھ ایسے نامسعود اور ناآسودہ حالات پیدا ہوئے کہ ایسے روشن خیال، بے باک اور اعتدال پسند اخباروں کی اہمیت شدت سے محسوس ہونے لگی اور ایسے ہی نازک حالات میں "پیام" روبہ زوال تھا۔ اس سے پہلے کہ مایوسی کی فضا عام ہو ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "سیاست" کی اجرائی عمل میں آئی۔ عابد علی خان اور ان کے رفیق محبوب حسین جگر صاحب، دونوں ملازم سرکار تھے۔ لیکن ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے ترقی پسند، روشن خیال اور سنجیدہ روزنامہ کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انھوں نے اپنی ملازمتوں کو چھوڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھا۔ یہ ایسا تجربہ تھا جس کی کامیابی کے امکانات کم تھے۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کی جیسی بھی حالت تھی وہ ان لوگوں سے ڈھکی چھپی نہیں تھی لیکن ان حضرات کی جرأت مندی، محنت اور مستقل مزاجی نے بالآخر انھیں اس تجربہ میں کامیاب بنالیا۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جسے ہم تاریخ میں کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ روزنامہ "سیاست" صرف، حیدرآباد ہی کا نہیں بلکہ پورے ملک کا پسندیدہ اور معیاری اخبار مانا جاتا ہے۔ کُل ہند بنیادوں پر "سیاست" نے یہ جو مقام حاصل کیا ہے اس کی وجہ سے حیدرآبادی اردو صحافت

کا سر اونچا ہو جاتا ہے۔ حیدرآباد میں روزنامہ "سیاست" کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے پیش نظر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہماری کمزوری بن گیا ہے۔ یا پھر حضرت اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں ؎

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت ۔۔ وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور ۔۔ تلاوت کرتے ہیں وہ "پانیر" کی

"پانیر" کی جگہ اب "سیاست" رکھ دیجئے بات پوری ہو جاتی ہے ؎

مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور ۔۔ تلاوت کرتے ہیں وہ سیاست کی

روزنامہ "سیاست" ہماری تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی، سائینی، سیاسی اور ادبی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ یہ حیدرآبادی صحافت و تہذیب کی پرانی قدروں کا نقیب بھی ہے اور جدید رجحانات کا علمبردار بھی۔ محب حسین نے جو تعمیر و اصلاح کا نقطۂ نظر دیا تھا وہی اندازِ نظر سیاست نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور قاضی عبدالغفار نے پیام کے ذریعہ جن سائنٹفک اور ترقی پسندانہ رویہ سے حیدرآبادی صحافت کو روشناس کرایا تھا وہی رویہ ہمیں یہاں بھی ملتا ہے۔ اور خود بھی "سیاست" کی جدت پسندیوں اور جدت طرازیوں نے اسے ملک بھر میں منفرد بھی اور ممتاز اخبار بنایا ہے۔ میانہ روی، اعتدال پسندی، غیر جانبداری، حقیقت پسندی اور ترقی پسندی صحافت کے بنیادی عناصر ہیں اور ان ہی عناصر کی بنیاد پر "سیاست" نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی ہے۔ بلاشبہ اردو صحافت کی ابتداء ۱۸۲۲ء میں کلکتہ کے "جام جہاں نما" سے ہوتی ہے اور حیدرآباد میں اس کا آغاز ۱۸۶۰ء میں "آفتاب دکن" کے طلوع ہونے سے ہوا ہے۔ نصف صدی کے اس فرق کے باوجود حیدرآبادی صحافت نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس فرق کو آپ ہند کے مختلف اخبار کا اور "سیاست" کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ہی سے محسوس کر سکیں گے۔ حیدرآباد میں صحافت کی غیر جانبداری، حقیقت پسندی کی ابتدا "سیاست" ہی کی وجہ سے ہوئی ورنہ اس سے پہلے بھی اور آج ہمارے بہت سے اخبار بے شعوری اور جانبداری کے جال میں کسی نہ کسی طرح

پھیلے ہوئے ہیں" سیاست" پہلا روزنامہ ہے جس نے غیر جانبداری کی مثال انتہائی نازک زمانے میں قائم رکھی اور شاید اسی وجہ سے یہ آج سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں یکساں طور پر قابلِ قبول بھی اور قابلِ مطالعہ سمجھا جاتا ہے۔ روزنامہ "سیاست" کی اس مقبولیت میں جہاں عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کا ہاتھ ہے وہیں ان محنتی اور باصلاحیت اور روشن خیال صحافیوں کا بھی حصہ ہے جو اس اخبار سے وابستہ ہیں۔

عابد علی خان صاحب[1] حیدرآبادی صحیفہ نگاروں میں اپنی سنجیدگی، خوش سلیقگی اور اصابتِ رائے کی وجہ سے بھی اور وسیع النظری اور خوش اخلاقی کی وجہ سے امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنی وضعداری اور منکسر المزاجی کے سبب نئی اور پرانی نسل کے لکھنے والوں اور تمام مکاتیبِ خیال کے لوگوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اعلیٰ مذہبی قدروں کے احساس کے ساتھ قومی اور ترقی پسندانہ ہے۔ اسی لیے "سیاست" کی پالیسی بھی ان ہی تینوں قدروں کی بنیاد پر قائم ہے

روزنامہ "سیاست" کے روح رواں محبوب حسین صاحب جگر ہیں۔ کبھی یہ حیدرآباد کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے تھے لیکن اب وہ صحافت اور "سیاست" کے لیے وقف ہو چکے ہیں اور ملک کے ممتاز صحافیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

عابد علی خان صاحب کے ساتھ جگر صاحب نے بھی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور سنہ ۱۹۴۹ء سے اب تک اسی اخبار سے وابستہ ہیں۔ یہ وابستگی ان کی جان کے ساتھ ہے اور جان سے عزیز بھی۔ جگر صاحب اور "سیاست" آج ہم معنیٰ الفاظ ہو گئے ہیں۔ جگر صاحب کی زندگی میں "سیاست" ایسے ہی داخل ہو گیا ہے جیسے رشید احمد صدیقی کی زندگی سے علی گڈھ یونی ورسٹی پیوست ہو گئی تھی۔ بقول محترمہ زینت ساجدہ "سیاست آج ہندوستان کے صفِ اول کے اردو روزناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور اپنی سلامت روی

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھئے "یارانِ شہر"

سنجیدگی، متوازن لب و لہجہ اور ذوقِ تربیت کی وجہ سے صحافتی دنیا میں اپنے لیے ممتاز مقام پیدا کر چکا ہے۔ سیاست کی اس کامیابی میں جگر کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بڑا دخل ہے۔ "محبوب حسین صاحب کو ابتدا ہی سے ادب و شعر کا ذوق ہے وہ افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ ان کا تخلص جگر جو اب ان کے نام کا جزو بن گیا ہے اسی ابتدائی شوق کی یادگار ہے۔ جگر صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کے بانیوں اور سرگرم کارکنوں میں سے ہیں۔ حیدرآباد میں جب ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو جگر صاحب نے اس میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ کرشن چندر نے اپنے رپورتاژ "پودے" میں ان ہی کی ذات کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے ص[۱]

روزنامہ "سیاست" میں جن دوسرے صحافیوں کا خونِ جگر رواں دواں ہے ان میں سرفراز ہاشم سعید، غلام حیدر، احمد رضا، مصطفےٰ علی بیگ، احسن علی مرزا[۲]، شاہد صدیقی، بابو راؤ، وہاب حیدر، اسد جعفری، میر حسن ص[۳]، مصطفےٰ علی اکبر، احمد معظم، مہدی عابدی، مہمان داد افسر علی، محمود انصاری[۴]، عبدالرحمٰن قلمی، حامد ظفر، س وعشرت، محمود بیگ، نسیم عارفی، جمال الدین علی خان، معراج محمد، شاہد عظیم، ذہانت علی بیگ، انور مسعود شامل ہیں۔

شاہد صدیقی حیدرآباد کے پرانے صحافی اور اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ انتقال سے پہلے وہ روزنامہ "سیاست" سے وابستہ تھے اور سیاست کے فکاہی کالم "شیشہ و تیشہ" لکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مجتبیٰ حسین نے شیشہ و تیشہ کو ترتیب دیا ہے۔ وہاب حیدر نے صحافتی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے گزیٹڈ افسیر تھے۔ پولیس ایکشن سے پہلے ملازمت چھوڑ کر بیدر سے حیدرآباد آ گئے اور پیام سے وابستہ ہو گئے۔ پیام کے بعد نظام گزٹ[۵]، اقدام، نگارہ اور بمبئی جانے کے بعد انقلاب، ہندوستان، اقبال اور کئی دوسرے رسائل سے وابستہ رہے۔ وہ کارٹونسٹ کی حیثیت

ص[۱]،[۲]،[۳]،[۴]،[۵] تفصیلات کے لیے دیکھئے "میرا شہر میرے لوگ" اور "یارانِ شہر"

سے ممتاز مقام رکھتے تھے۔ "شعر پہ شورش" غالب کے شعروں پر بنائے گئے کارٹون پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوا۔ عشرت صدیقی پیام سے بھی وابستہ تھے۔ ترقی پسند ہونے کے باوجود گاندھی وادی کے قائل تھے چنانچہ مسلمان ہونے کے باوجود گوشت کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ آج کل لکھنؤ کے معروف اخبار قومی آواز (ایڈیٹر حیات اللہ انصاری) سے وابستہ ہیں۔ ہاشم سعید، غلام حیدر، مصطفے علی بیگ، عبدالرحمن حلمی، جہان دار افسر اور منور علی بھی پرانے اور کہنہ مشق صحافیوں کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ احمد معظم کو صحافتی ذوق ان کے والد احمد عارف سے ورثہ میں ملا ہے۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں ایک مختصر سے عرصہ کے لیے راقم الحروف کو بھی روزنامہ "سیاست" میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اسی سال وہ دہلی چلے گئے جہاں "حیات" کے ایڈیٹر بنائے گئے اور آج کل کمیونسٹوں کے ایک اور رسالہ سوویت جائزہ کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اسد جعفری ہمارا اقدام اور تازیانہ میں کام کرنے کے بعد سیاست سے منسلک ہو گئے اور احمد معظم کے بعد انہیں "حیات" کے لیے دہلی بلا لیا گیا۔ جہاں چھت پر سے گر پڑنے کی وجہ سے ۶ ڈسمبر سنہ ۱۹۷۱ء کو انتقال ہو گیا۔ عبدالرحمن حلمی روزنامہ نظام گزٹ کے بند ہو جانے کے بعد "سیاست" سے وابستہ ہیں

مس و عشرت صحافی کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ ہاشم سعید خاموش طبیعت، سنجیدہ اور تجربہ کار صحافی ہیں۔ محمود انصاری کو بچپن ہی سے ادب کا چسکہ ہے۔ انہوں نے ابتداء میں بچوں کے لیے ایک رسالہ گلشن جاری کیا تھا اور "بھر کا گل" ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہوئے۔ بڑی مدت تک سیاست سے وابستہ رہ کر اب "منصف" جاری کیا ہے۔ مہدی عابدی عرصہ دراز تک حیدرآباد کے مختلف اخباروں سے وابستہ رہے۔ "حیات" ہفتہ وار سے منسلک ہونے سے پہلے یہ "سیاست" میں کام کر رہے تھے۔ جہاں دار افسر کا بھی ہمارے پرانے صحافیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مصطفے علی اکبر نے مسلسل محنت، اپنی دلچسپی، لگن، شوق اور کوشش سے اردو صحافت میں اپنا خاص مقام بنایا ہے۔ حیدرآباد کی صحافت سے ان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ عرصہ دراز تک روزنامہ "سیاست" میں کام کرتے رہے۔ ان دنوں AIR آل انڈیا ریڈیو

دلی سے وابستہ ہیں۔ عابد علی خان صاحب کے بڑے صاحبزادے زاہد علی خان نظام کالج سے گریجویشن کی تکمیل کے بعد روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ زاہد صاحب سنجیدہ، ذہین اور خاموش طبیعت نوجوان ہیں اُردو صحافت سے ان کی دلچسپی روزنامہ "سیاست" کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ صلاح الدین نیّر تعلیمی ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ کے کام کے علاوہ شعری کالموں کی ترتیب میں اعزازی طور پر معاونت کرتے ہیں۔

روزنامہ "سیاست" میں کام کرنے والے ان ترقی پسند اور روشن خیال صحافیوں کے علاوہ ملک کے تقریباً سبھی بڑے اور نامور ادیبوں، شاعروں، سیاست دانوں، ماہرین قانون وطب، سماجی کارکنوں اور عہدہ داروں کا تعاونِ قلم حاصل ہے۔ مثلاً قاضی عبد الغفار، پنڈت سندر لال، نواب مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ، بھیم سین سچر، ڈگمبر راؤ بندو، فراق، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، رضیہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، جوش، جگر، جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، مجروح، ہارون خان شیروانی، عبد القادر سروری، آغا حیدر حسن مرزا، ڈاکٹر وحید الدین، خواجہ احمد فاروقی، ڈی راما راؤ، گوئینداس عشرف، گوپال راؤ اکبوٹے، یم نرسنگ راؤ، سعید جنگ، احمد جنگ، غلام یزدانی، سی ڈی دیشمکھ، بدر الدین طیب جی، فضل الرحمن، جانگی پرشاد، ایل این گپتا، ہاشم امیر علی، قاری کلیم اللہ، کے وی رنگا ریڈی، مسعود حسین خان، زینت ساجدہ، پی جی پرانک، نور محمد نور، رشید الدین خاں، حسن عسکری، وحید اللہ خان، علی محمد خسرو، سید محمد، اشفاق حسین، عاقل علی خان، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، محبوب نارائن، حیرت بدایونی، مرزا شکور بیگ، موہت سین، جہاں بانو نقوی، جعفر حسن، گوتم ماتھر، راج بہادر گوڑ، سری نواس لاہوٹی، ابو الحسن صدیقی، سردار علی خان، حاجی بشیر احمد، مولانا قطب الدین حسینی، حبیب الرحمن، عبد الوحید خان، کے وی نارائن ریڈی، طیب انصاری، امجد یوسف زئی، حسن الدین احمد، سلیمان خطیب، خواجہ معین الدین، محمد عبد القوی، اکبر الدین صدیقی، شہریار کادسی جی، تعرج احمد خان، سیدہ جعفر، بانو طاہرہ سعید، مولانا حامد صدیقی، حافظ ابو یوسف، سعید شہیدی، شاذ تمکنت، سلیمان اریب، ڈاکٹر عبد المنان،

یوسف حسین خان، عائشہ حمیرہ، سیدہ مجیدہ، امۃ ابوالحسن، جیلانی بانو، کمال الدین علی خان، اعجاز قریشی، عزیز قیسی، صلاح الدین نیّر، وقار خلیل، احمد جلیس، مغنی تبسم، عظمت عبد القیوم اور ملک کے سارے ہی مشہور و معروف ادیب و شاعر۔

روزنامہ "سیاست" کے اداریئے اپنے متوازن لب و لہجہ، سنجیدگی، ترقی پسندی، روشن خیالی اور اصابت رائے کی وجہ سے عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ میرے پیش نظر مولانا حالیؔ کے متعین کردہ اعلیٰ صحافت کے چند اصول بنیاد ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ ایک لائق اخبار نویس کے فرائض ہیں کہ وہ اپنی جنرل انفارمیشن کو وسعت دے، اپنی طرزِ تحریر میں اعتدال پیدا کرے، مدح و ستائش میں مبالغہ نہ فرمائے، نکتہ چینی میں خیر خواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دے، جب تک خبر کسی معتبر ذریعہ سے نہ پہنچے اس وقت تک اُسے شائع نہ کرے، ظرافت بقدرِ ضرورت سے زیادہ کام میں نہ لائے۔ تحریر میں سادگی، متانت اور جامعیت اختیار کرے، اخباروں کی کتابت، چھپائی اور صحت کا نہایت کوشش اور توجہ سے خیال رکھے۔ اخبار بالکل معین اور مقررہ تاریخ پر شائع ہوا کرے اور اصل اصول سچائی اور راستی ہو"۔ حالیؔ کے متعین کردہ ان معیارات کی روشنی میں ہندوستان کے اُردو اخباروں کا مطالعہ یقینی مفید بھی اور دلچسپ رہے گا۔ اور مجھے یقین ہے چند ہی ایسے اخبار ہوں گے جو اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان چند اخباروں میں یقیناً روزنامہ "سیاست" شامل ہے۔

روزنامہ "سیاست" میں کام کرنے والے کارکن صحافیوں کے مطالعہ کے لیے ملک اور بیرون ملک کے اہم اخبار مہیا کیئے جاتے ہیں تاکہ ان کے معلومات وسیع ہوں اور وہ حالات سے باخبر بھی رہیں۔ روزنامہ "سیاست" کی اعتدال پسندی اور اصابت رائے کی وجہ سے یہ اخبار ملک کے سنجیدہ، ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اور حکومت کی نظروں میں پسندیدہ اور مقبول بن گیا۔ بے جا مدح سرائی، مبالغہ آمیزی اور سنسنی خیزی کو روا نہیں رکھا گیا ہے اور نکتہ چینی میں خیر اور بھلائی کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے" پچھلے برسوں میں کئی ایسے واقعات ملتے

میں اور مقام آتے ہیں کہ سیاست نے ریاست کے اہم مسائل سے متعلق اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس نے ایک طاقت ور صحت مند اپوزیشن کا بھی رول ادا کیا ہے۔ اور حکومت سیاسی جماعتوں، دونوں کی رہبری کی ہے۔ اور یہ اعزاز شاید سیاست کا واحد امتیاز ہے

جہاں تک روزنامہ سیاست کی پالیسی کا تعلق ہے خطوط کا تعین کرتے ہوئے ایڈیٹر سیاست نے پہلی اشاعت کا اداریہ (۱۵ اگسٹ ۱۹۴۹ء) سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میں سیاست کو کشکول بناکر آپ کے پاس حاضر نہیں ہو رہا ہوں۔ میں زندگی کے قافلہ میں درماندہ رہبروں کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ اسی آدرش کے لیے سیاست جاری ہوا۔ سیاست کسی فرد اور جماعت، کسی رنگ اور کسی گروہ سے وابستہ نہیں۔ چونکہ ایسی وابستگی کسی اخبار نویس کیلئے سم قاتل ہے۔ سیاست جانب دارانہ حکمت عملی سے ہمیشہ گریز کرے گا۔ اور ایک غیر جانبدار جریدہ کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرے گا۔ سیاست اس دور میں باہمی رواداری اور صحت مند جمہوری رجحانات کے فروغ و ارتقائ کے لیے اپنا مقدس فرض ادا کرے گا۔ سیاست اپنے ماتھے پر کوئی قشقہ لگائے بغیر اپنی ذات سے کسی تحریک کو وابستہ کیے بغیر اداروں اور جماعتوں کی وابستگی کے طوفاں اور آندھی سے اپنا دامن بچاکر دکھی انسان اور انسانیت کا ساتھ دے گا۔ جس کا مذہب پہچانا نہیں جاتا جو صرف انسان ہے مذہب نہیں، کوئی تحریک نہیں، کوئی جماعت نہیں۔ ان مقاصد کے ساتھ آپ کی بزم میں حاضر ہوا ہوں اور مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ سپیدہ سحر کو دیکھ رہا ہوں ۔ اور سیاست میں انہی کرنوں کا نور بکھیرنا چاہتا ہوں۔"

۲۵، ۳۰ سال ہوئے سیاست، ان اعلیٰ اصولوں اور قدروں کے ساتھ تنہا ہی جانب منزل چلا تھا لیکن آج وہ میر کارواں بن گیا۔ وہ ایک تحریک بھی اور ایک ادارہ بھی! سیاست کی غیر جانبدار، ترقی پسند، اور اثباتی پالیسی اور پڑھنے والوں کے ذہن میں جو قدر مشترک ہے وہ اس خطۂ ملک میں نئی ذہنی بیداری کا ایک روشن مینار ہے اور قدیم و جدید حیدرآباد کی اتصالی کڑی بھی۔ اور وہ اس دعوی میں بھی حق بجانب ہے کہ حیدرآباد

کے اردو اخباروں میں سیاست کے قارئین کا وسیع حلقہ ریاست کے اردو پڑھنے والوں کے ترقی پسند ذہن کا آئینہ دار ہے۔ جس پر نیا سماج فخر کر سکتا ہے۔

حالی نے اپنے معیاروں میں "معتبر ذریعہ" کو خاصی اہمیت دی ہے۔ اس اعتبار سے بھی روزنامہ سیاست مکمل اخبار ہے۔ سیاست نے سب سے پہلے اسٹاف رپورٹر اور اضلاع میں نامہ نگاروں کا تقرر کیا اور نامہ نگاروں کو معاوضہ کے علاوہ پریس ٹیلگرام اور ٹرنک کال کی سہولتیں دیا ہیں۔ ریاست بھر میں، ریاست کے باہر ملک بھر میں اور ان کے علاوہ دنیا کے بعض اہم شہروں میں بھی اس کے کالم نویس موجود ہیں۔ چنانچہ معظم صدیقی (برکلے) امریکہ، یوسف امتیاز (کناڈا)، نصیر اختر صدیقی (لندن) برطانیہ، فخرالدین الہندی (قاہرہ) اور اسداللہ (برلن) مشرقی جرمنی قابل ذکر ہیں۔

خبروں کے علاوہ اتوار اور پیر کے ایڈیشنوں میں ممتاز شخصیتوں سے انٹرویو، مضامین، پریس سمینار، سمپوزیم، شعبۂ جرنلزم جامعہ عثمانیہ کے سروے اور رپورتاژ کے ذریعہ اخبار کے کالموں کے لیے مفید معلوماتی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ سیاست فیچر سروس، یونیورسٹی راونڈ اپ، اگریکلچرل یونی ورسٹی راونڈ اپ، تعلیمی اداروں کا تعارف، ڈاکٹروں سے انٹرویو، قانونی نکات پیرو کلائے کے نوٹس، آپ کا کالم، حیدرآباد ڈائری، دلی ڈائری، لندن، امریکہ، الجیریا، برلن، ماسکو سے خصوصی مکاتیب کا انتظام۔ نئی کتابوں پر تبصرہ، شعری کالم، منتخب اشعار، طلبا کے کالم اور فلمی صفحہ وغیرہ روزنامہ کی دیگر خصوصیات ہیں۔ پیر کے ایڈیشن میں خانوادہ آصفی سے متعلق پرانی تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ آپ کا کالم موضوعات کے اعتبار سے دلچسپ ہوتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ سیاست ہر اعتبار سے ایک مکمل اخبار ہے۔

اُردو کے ادبی رسائل — ایک جائزہ

۱۸۵۹ء تا ۱۹۵۹ء

فرخندہ بنیاد حیدر آباد کی بنیاد گو ۱۰۰۰ھ میں رکھی گئی لیکن اس سے بہت پہلے ہی گولکنڈہ میں اردو زبان و ادب کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ جس بادشاہ نے اس زبان کو دوام بخشا ہے اور جس نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اردو زبان و ادب کو عام کیا ہے، وہ محمد قلی ہے۔ محمد قلی دکن کا پہلا تاجدار ہے جس نے اردو زبان کی مکمل سرپرستی کی اور اردو ادب و شعر کے فروغ کے لئے اہل قلم کی ہمت افزائی فرمائی۔ شہر حیدر آباد کی بنیاد کا اصلی سبب بھاگ متی ہے یا نہیں اس سے مجھے یہاں بحث نہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس شہر کی بنیاد کا اصلی محرک جذبۂ عشق ہے! اور یہ جذبۂ عشق دو صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک تو شہر حیدر آباد کی حسین و خوبصورت عمارتوں اور شاہراہوں کی شکل میں، دوسرا حلاوت آگیں زبان اردو کی صورت! اس لئے جہاں میں حیدر آباد کو محمد قلی کے تمدن اور تعمیری ذوق کا مظہر قرار دیتا ہوں وہیں اُردو زبان کو اسی شہزادۂ رنگین مزاج کے ادبی اور شعری جذبہ کا پرتو۔ شہر حیدر آباد اور اردو زبان دو مختلف چیزیں ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک ہی جذبہ کار فرما ہے اور وہ ہے

محمد قلی کا جذبۂ عشق ! اس وجہ سے بعد کے سیاسی اور تہذیبی انقلابات حیدر آباد اور اردو کو جدا نہ کر سکے۔ حیدر آباد بنیادی طور پر "شہر اردو" ہے۔ چنانچہ شاہی دور کے بعد آصفیہ عہد میں اور پھر آزادی کے بعد، آج بھی اردو اس شہر کی اہم اور عام زبان ہے۔ یہ بات شاعرانہ نہیں ہے کہ حیدر آباد کی بنیاد اردو زبان و ادب کے سنگ ریزوں پر رکھی گئی ہے اس شہر کی خوبصورتی میں محمد قلی کے ذوق کی میناکاری کا دخل ہے، وجہی اور غواصی کا تصور حسن ہے، آصفی مزاج کی شان و شوکت ہے اور اس میں آزاد شہریوں کی طبیعتوں کی جولانیٔ فکر اور ندرتِ خیال عیاں ہے۔ اس شہر کا مزاج بنیادی طور پر ادب و شاعری کا مزاج ہے اور تا ابد یہی مزاج باقی و زندہ رہے گا۔

محمد قلی قطب شاہ کا دور اردو ادب کا دور اولین ہے، لیکن عجیب بات ہے اس ابتدائی دور ہی میں اس زبان کو جو غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل ہوئی۔ اس کی مثال بعد کی صدیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھنے والا اس پہلے محسن اردو کی خدمات کے اعتراف کے بعد کسی دوسرے تاجدار دکن کا نام لے سکتا ہے، جس نے محمد قلی کی طرح اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دی ہے تو یقیناً وہ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا نام ہو گا۔ لیکن محمد قلی (وفات ۱۰۲۰ھ) سے لے کر آصف جاہ سابع (تخت نشین ۱۳۲۹ھ) کے درمیان ان تین صدیوں میں اردو زبان اپنی ارتقا کی منزلیں کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی سست گامی سے برابر طے کرتی رہی اور ادب کے سرمایہ میں کبھی بیش بہا اور کبھی کم مایہ اضافے ضرور ہوتے رہے ہیں۔ ظل اللہ، عبداللہ، اور تانا شاہ کا زمانہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا روشن دور نہ سہی لیکن ایسا زمانہ بھی نہیں کہ ہم اسے بالکل ہی فراموش کر دیں۔ زوالِ تانا شاہ کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں دکن کی حیثیت ایک صوبہ کی قرار پائی اور مرکزیت حیدر آباد سے نکل کر دلی اور پھر اورنگ آباد منتقل ہو گئی۔ اس طرح گویا حیدر آباد کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

۱۱۳۶ھ میں حضرت آصف جاہ اول نے مغلیہ سلطنت کے انحطاط اور زوال سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہی دکن کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور ۱۱۷۳ھ میں نواب نظام علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد اورنگ آباد سے حیدر آباد کو اپنا دار السلطنت منتقل کر دیا۔ گویا جو چمنِ صد رنگ خزاں رسیدہ ہو چلا تھا وہاں پھر سے بادِ حیات کے جھونکے چلنے لگے۔ نسیم صبح گاہی نے زندگی کا نیا پیام دیا۔ گل و گلزار کھلکھلا پڑے، بلبلِ شیریں نوا چہکنے لگی، اور شہر کی عمارتوں، وسیع محلات اور لمبی لمبی سڑکوں پر زندگی رواں دواں نظر آنے لگی۔ شہر اردو پھر سے انجمن آرائی میں مصروف نظر آنے لگا۔ تہذیبی قدریں اور سماجی اصول فروغ پانے لگے، ادب اور شائستگی نے نیا انداز اختیار کیا۔ یہ نئی تبدیلی آگے چل کر اردو زبان و ادب کے لئے بھی اور اردو صحافت کے لئے شگون نیک ثابت ہوئی۔

ویسے عہد قطب شاہیہ کی ایک کتاب "احکام الصلوٰۃ" ہے جسے رسالہ بھی کہا جاتا ہے۔ اول تو یہ ادبی رسالہ نہیں اور پھر اس کی اہمیت تاریخی ہے۔ اس زمانہ میں ہر مذہبی کتابچہ کو رسالہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس لئے اس قسم کے رسالے ہمارے دائرہِ تحریر سے باہر ہیں۔ موجودہ دور میں رسائل کی جو تعریف کی گئی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو واقعتاً رسائل کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک جدید اصطلاح کا تعلق ہے اس کے پیش نظر ہمیں آصفی عہد کے اولین دور میں چند رسائل کے نام ضرور ملتے ہیں۔ جو چھاپہ خانہ کے ایجاد کے بعد شائع کئے گئے ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت بھی جداگانہ ہے۔ امیر کبیر شمس الامراء ثانی کی سرپرستی میں اردو نثر ترقی کرتی رہی۔ حیدر آباد کے امراء میں بہت کم ایسے تھے جنھیں علم و ادب کا ذوق و شوق تھا خصوصاً ابتدائی دور میں ایسے چند ہی ہستیاں ہی نظر آتی ہیں جنھوں نے علم و ادب کی خدمت کی ہو اور جو صاحب ذوق اور صاحب علم بھی تھے شمس الامراء ثانی نے علم و ادب کے فروغ کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ٹھیک ڈھنگ سے جائزہ لینے اور ان خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کی ضرورت ہے۔

ان کے ادبی اور علمی کارناموں کے پیش نظر شمس الامرا، کو شمس العلمار کے نام سے یاد کریں تو زیادہ مناسب اور صحیح ہوگا۔ انھوں نے علم و فن کی ترویج کے لئے شعرار اور مصنفین کی ہمت افزائی کی۔ مولفین و مصنفین کے نام پر منصب اور تنخواہیں جاری ہوئیں چنانچہ قیس، آفاق اور شہرت وغیرہ آپ کی سرکار سے معقول طور پر بہرہ مند تھے۔

۱۸۲۶ء میں انگریزی کی سائنسی کتابوں کا اردو ترجمہ کا کام شروع ہوا۔ ان ہی کتابوں کو رسالہ کہا گیا۔ بہرحال یہ کتابیں، کتابیں ہی تھیں، رسائل نہیں لیکن ان کتابوں کی اشاعت سے حیدرآباد میں رسائل کے اجرار کے لئے ماحول سازگار بنا۔ اور ۱۸۲۶ء کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۸۵۹ء میں حیدرآباد سے رسائل کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔

رسالہ طبابت حیدرآباد میں رسائل کی اشاعت کا آغاز جس رسالہ کو سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت طبی رسالہ ہے جو ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا۔ اس میں طب سے متعلق مضامین شامل کئے گئے۔ اور مدرسہ طبیہ کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ اس رسالہ کے نگران جارج اسمت تھے۔

مراۃ القوانین طبی رسالہ کے بعد جو دوسرا رسالہ جاری ہوا وہ قانون سے متعلق تھا۔ ۱۸۶۶ء میں مہدی علی نے مراۃ القوانین جاری کیا، جس میں قانونی نکات اور نظائر پیش کئے جاتے تھے۔ اپنی افادیت کے پیش نظر یہ رسالہ وکلار اور قانون پیشہ طبقہ میں مشہور و مقبول رہا ہے۔ اس میں ہر ماہ قانون سے متعلق مضامین بھی شامل ہوا کرتے تھے۔

مخزن الفوائد ماہنامہ مخزن الفوائد مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک نے ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۵ء میں جاری کیا تھا۔ علمی، ادبی اور معلوماتی اعتبار سے رسالہ طبی کا گنوار بن جاتا رہا اور اس کی جگہ ادبی اظہار نے لے لی۔

اخبار شفق ماہ محرم ۱۲۹۵ھ م جنوری ۱۸۷۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہفتہ وار اخبار تھا۔ اور یہ فارسی رسالہ تھا۔

اخبار شوکت الاسلام ابتدا میں ۱۲۹۷ھ سے بمقام مدراس مولوی حاجی کرتان شائع ہونا شروع ہوا۔ بعد مدار المہام مہاراجہ نریندر بہادر پیش کار ۱۳۰۰ھ میں شوکت الاسلام مدراس سے حیدر آباد منتقل ہوا ۱۳۰۶ھ سے اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا تھا۔

اخبار آصفی ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ سے بڑی تقطیع اور زرد رنگ کے کاغذ پر شائع ہونے لگا، اس کے نگراں بھی مولوی محمد سلطان عاقل ہی تھے۔ پرانی حویلی میں اس کا دفتر واقع تھا۔

افسر الاخبار ۱۳۰۴ھ میں بسرپرستی کرنل افسر الملک جاری ہوا۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے بعد نواب سکندر جاہ (۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۹ء) نواب ناصر الدولہ (۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء) اور نواب افضل الدولہ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء) کے دور حکومت میں یقیناً اردو زبان و ادب میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اور نامور شاعر بھی پیدا ہوئے۔ شمس الامراء اور مہاراجہ چندو لال جیسی علم دوست شخصیتوں نے اس زبان کا لنگر تھام لیا تھا۔ اور ایسے ہی جوہر شناس سرپرستوں کے زیر نگرانی اردو کا قافلۂ شوق منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا ہے، لیکن زبان کی غیر معمولی ترقی کا زمانہ یا پھر دور آصفی میں اردو زبان و ادب کا نشاۃ ثانیہ کا آغاز جس زمانہ میں ہوا وہ والی دکن محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا دور ہے۔ ویسے اس سے قبل بیجاپور کے عادل شاہی دور میں اردو کو سب سے پہلے سرکاری زبان کی حیثیت ملی اور قطب شاہیوں نے بھی اس زبان کو اپنی زبان بنایا ہے لیکن آصف جاہی سلاطین میں نواب میر محبوب علی خان کے زمانہ میں اولاً ۱۲۸۰ھ میں جب زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو اس وقت صرف اتنی اجازت دی گئی کہ نظماً عدالت کی رائے ہو تو وہ گواہان یا اہل معاملہ سے اظہار اردو میں قلمبند کریں۔ اس کے بعد ۱۲۹۳ھ میں ایک اور قدم آگے کی طرف بڑھایا گیا

اور نظماً عدالت کی رضامندی کی قید اٹھالی گئی۔ اور یہ لازم قرار دیا گیا کہ اردو اظہار قلم بند ہوا کرے۔ مگر اہلِ مقدمہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی درخواست خواہ اردو میں پیش کریں خواہ فارسی میں۔ عدالت کے ساتھ اس زمانہ میں دفاتر مال اور بندوبست اردو میں کر دیئے گئے۔ سنہ ۱۲۹۵ء اس گشتی کے مطالب اور زیادہ وسیع کئے گئے اور حکم دیا گیا کہ فیصلوں میں اظہارات بجنسہٖ اردو میں لکھے جائیں۔ اس طرح گویا اردو زبان نے ریاست حیدرآباد میں سرکاری حیثیت اختیار کرتی گئی۔ اس دور کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں داغ، شاہ نصیر، امیر مینائی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، میر مہدی علی محسن الملک، مشتاق حسین وقار الملک، مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ، مرزا یار بیگ سرور جنگ، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، سید علی بلگرامی اور عبدالحلیم شرر کے علاوہ ظفر علی خاں جیسی عہد آفریں شخصیتیں حیدرآباد سے وابستہ ہو گئیں تھیں۔ ان بزرگوں میں سے سرشار، شرر، محسن الملک، وقار الملک، سید علی بلگرامی اور ظفر علی خاں نے حیدرآباد کے ادبی رسائل کو نئی قدریں اور نئے رجحانات سے مالا مال کیا ہے۔

رسالہ ادیب

رسالہ طبابت اور مخزن الفواید کے بعد جراید کی اشاعت کا سلسلہ چل پڑا اور یہ رسائل عوام میں مقبول بھی ہوئے۔ ان کی اجرائی کی وجہ سے اخبار بینی کا شوق بھی عام لوگوں میں پیدا ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۲ء میں انجمن اخوان الصفات حیدرآباد کے زیر اہتمام میر کاظم علی غازی نے ایک رسالہ ادیب جاری کیا۔ یہ رسالہ ۳۴ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ اور تقریباً اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ اس طرح گویا اسی سال اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ دوسری بار سنہ ۱۹۰۸ء میں خورشید علی نے ادیب کو جاری کیا اور اس رسالہ سے اردو کے ممتاز رباعی گو شاعر امجد حسین امجد بھی وابستہ ہو گئے۔ اس زمانہ میں ظفریاب خاں اس رسالہ کے مہتمم تھے۔ مرزا کاظم علی حیدرآباد کے مشہور صحافی رہے ہیں۔ ادیب کی اجرائی سے قبل ہی انھوں نے سنہ ۱۸۷۰ء میں روزنامہ "خورشید دکن" جاری کیا تھا۔

شوکت الاسلام حاجی محمد کرتان کی ادارت میں ۵ نومبر ۱۸۸۸ء میں سب سے پہلے پونا، بمبئی اور پھر سکندر آباد سے شائع ہونے لگا۔ حیدر آباد کے ایک محقق جناب سجن لال صاحب کے بیان کے مطابق اس کا ایک سپلیمنٹ "مسرور القلوب" کے نام سے بھی ۲۸ فروری ۱۸۸۶ء سے سکندر آباد سے شائع ہوا کرتا تھا۔ شوکت الاسلام، حاجی کرتان ہی کی ادارت میں "روانہ" بھی ۱۸۷۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اگر سجن لال صاحب کے مطابق یہ ہفتہ وار ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا تو یہ بات مزید تحقیق طلب ہے کہ کیا انھوں نے ۱۸۷۸ء میں روزنامہ جاری کرنے کے بعد پونا چلے گئے تھے، جہاں سے انھوں نے ۱۸۸۸ء میں پھر اسی سال حیدر آباد سے اپنا ہفتہ وار جاری کیا۔

رسالہ حسن ادبی رسائل میں معیار کو پیش کرنے والا یہ رسالہ حسن ابن عبد اللہ نواب عماد نواز جنگ کی زیر ادارت تقریباً نو سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے لکھنے والوں میں حیدر آباد کے علاوہ شمالی ہند کے بڑے ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔ اس رسالہ میں علم اللسان، تاریخ، مذہب، سائنس اور سیاست سے متعلق فکر انگیز مضامین شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا اور تقریباً نو سال تک اردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمات انجام دیتا رہا ہے۔

معلّم نسواں محب حسین نے معلم نسواں سے قبل ۱۸۸۲ء میں معلم شفیق جاری کیا تھا بعد کو اس ماہنامہ کا نام بدل کر ۱۸۹۲ء میں معلم نسواں جاری کیا۔ معلم نسواں میں پردہ، عورتوں کی تعلیم، لباس اور اسلام میں عورتوں کے مقام سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

آئینِ دکن مولوی فدا حسین نے قائم گنج (یوپی) سے حیدر آباد منتقل ہونے اور قانون کی تعلیم حاصل کر کے اورنگ آباد منتقل ہونے کے بعد ۱۸۹۲ء میں آئینِ دکن جاری کیا۔ ۱۸۹۳ء میں وہ پھر حیدر آباد میں منتقل ہو گئے۔ ان کے ساتھ

آئینِ دکن کا دفتر بھی حیدر آباد منتقل ہوگیا۔

محبوب القلوب ۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ سے ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔ عماد السلطنت کی زیرِ سرپرستی شائع ہوتا تھا۔

ملک و ملت ۲ر شعبان ۱۳۱۳ھ م ۱۸۹۶ء سے ہر ہفتہ شائع ہوا کرتا تھا۔ ملک و ملت کے مالک قاضی رفیع الدین اور ایڈیٹر سعید احمد ناطق لکھنوی تھے۔ تقریباً چار پانچ سال تک یہ رسالہ جاری رہا، اور ملک و ملت کی ادبی و دینی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس رسالہ کو سرکاری امداد بھی حاصل تھی۔

نظارۂ عالم ۱۳۱۴ھ، ۱۸۹۷ء سے منشی قدرت اللہ مضطر کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۱۳۱۷ھ میں حکومت نے اس رسالہ کو بند کروایا دفتر الہ آباد منتقل ہوگیا۔ بعد ازاں پھر بلدہ حیدر آباد سے جاری ہوا۔ اور یہ ہفتہ روزہ ۱۳۱۹ھ تک شائع ہوتا رہا۔

جامِ جمشید ماہ جمادی الاول ۱۳۱۴ھ سے ابراہیم خان ہفتہ روزہ جام جمشید جاری کیا۔ یہ ایک سیاسی ہفتہ وار تھا، چند دنوں تک دو روزہ اور سہ روزہ بھی چھپتا رہا۔ تقریباً دس برس تک یہ اخبار جاری رہا، اور ۱۳۲۳ فصلی میں بند ہوگیا۔

سحرالبیان ماہ رمضان ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں مولوی مجیب احمد تمنائی کے زیرِ ادارت ہر ماہ کے آخر میں سحرالبیان شائع ہوتا تھا۔ اس رسالہ میں ڈرامے، سوانح حیات اور مختلف موضوعات پر مضامین شامل ہوا کرتے تھے۔

مجیب احمد تمنائی سہارن پور کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی، اور بنارس میں بھی عرصہ تک ان کا قیام رہا۔ اسی قیام کے دوران

انھوں نے ادب وشعر سے دلچسپی لینی شروع کی. چنانچہ رسالہ مہذب کپورتھلہ انھوں نے اخلاق کے موضوع پر مضامین لکھنا شروع کیا۔ الہ آباد ریویو، حسن حیدرآباد، آزاد لکھنو، سرمور گزٹ ناہین، ابن الوقت گورکھپور، وفادار وصدائے ہند لاہور۔ تصویر عالم کانپور زیادہ تر آپ کی ادبی تصاویر کے مرقع ہیں۔ عربوں کی گذشتہ تجارت اور سکندر ذوالقرنین دو مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد یہاں کی صحافت میں انھوں نے عملاً حصہ لیا۔ اور عرصہ دراز تک مشیر دکن سے وابستہ رہے۔ کشن راو انجہانی سے ان کے مخلصانہ روابط تھے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کے مختلف رسائل اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔ وہ حیدرآباد کے سرکردہ صحافیوں میں شمار ہونے لگے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے اپنا ایک رسالہ "سحرالبیان" جاری کیا جو معیار کے لحاظ سے منفرد رسالہ تھا، لیکن یہ رسالہ زیادہ دنوں تک چل نہ سکا۔ اور غالباً اس کے تین ہی شمارے شائع ہوئے۔

دلگداز

حیدرآباد آنے سے قبل سنہ ۱۸۹۰ء میں عبدالحلیم شرر نے لکھنو سے ایک ہفت روزہ مہذب جاری کیا تھا جو اپنے معیار اور اعلیٰ ذوق کی وجہ سے بے حد مقبول تھا۔ جس زمانہ میں مہذب جاری ہوا برعظیم کی سیاست میں خاصی ہلچل موجود تھی۔ اصلاح معاشرہ کی مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ سرسید، شبلی، حالی اور نذیر احمد کی رہنمائی میں اردو ادب میں انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ شرر ان تبدیلیوں سے واقف تھے اس لئے انھوں نے مہذب کو ان ہی تین اصولوں کے تابع کرلیا۔ "پالٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر" اور اپنی اس پالیسی کی وجہ سے بہت جلد مہذب مقبول ہوگیا۔ جب شرر حیدرآباد آئے تو مہذب کا یہ تجربہ ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے سنہ ۱۸۹۶ء میں دلگداز جاری کیا۔ شرر نے اس رسالہ کو معنوی اعتبار سے بھی دلگداز بنادیا تھا۔ مفید الاسلام پریس سے چھپ کر باغ محی الدین بادشاہ محلہ ترپ بازار حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔

افسر افسر پہلے پہل فوجی پرچہ کی حیثیت سے ۱۸۹۷ء میں افسر الملک کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ بعد کو اس کی ادارت مولوی محب حسین اور مولوی عبد الحق نے سنبھالی تو رفتہ رفتہ اس میں ادبی مضامین بھی جگہ پانے لگے۔

پیام محبوب ماہ محرم ۱۳۱۵ھ سے زیر ادارت مولوی غلام حسین داد شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں غزلیات، متفرق مضامین اور ناول کا حصہ رہتا تھا۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ لیکن ۱۳۲۳ھ سے یہ رسالہ دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اور دوبارہ ماہ ذیعقدہ ۱۳۲۵ھ سے موقوف ہوا۔

شمس الکلام یہ ماہنامہ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ سے زیر ادارت مولوی سلیمان مہدی خاں منتظم دفتر پیشی نواب لطف الدین خاں بہادر، شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں صرف غزلیات ہوا کرتی تھیں۔ ۱۳۱۷ھ میں بند ہوا۔ اس رسالہ کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ مفت تقسیم ہوتا تھا۔ اس قسم کی مثال تاریخِ صحافتِ اردو میں منفرد ہے۔

دبدبہ آصفی مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں دو ادبی رسائل شائع ہوتے تھے ایک دبدبہ آصفی اور دوسرا محبوب الکلام

دبدبہ آصفی ۱۸۹۵ء میں اور محبوب الکلام ۱۸۹۸ء میں جاری ہوئے۔ ابتدائی زمانہ میں ہیرالال دونوں رسالوں سے منسلک رہے محبوب الکلام میں چندا پرشاد کی معاونت انھیں حاصل تھی۔ فصاحت جنگ جلیل جب حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور مہاراجہ کی خدمت میں باریابی کا موقع ملا تو انھیں دبدبہ آصفی اور محبوب الکلام کی ترتیب کا کام سونپا گیا۔ اسی زمانہ میں حضرت جلیل نے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اختر مینائی کی معیت میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے حیدرآباد کی ایک تاریخ بھی اسی زمانہ میں لکھی تھی۔ حضرت میر محبوب علی خاں کے دربار میں جب ان کی باریابی ہوگئی اور استادِ شاہ کا مقام ملا تو

انھوں نے ان فرائض سے سبکدوشی اختیار کی۔ اس ماہنامہ سے رتن ناتھ سرشار نے جب وابستگی اختیار کی تو اس کی ادبی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کا سلسلہ ۱۹۱۶ء سے دبدبۂ آصفی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں حیدر آباد کے رسائل میں "اودھ پنچ" کی بذلہ سنجی اور ظرافت بھی داخل ہو گئی۔

عزیز الاخبار عزیز جنگ ولاؔ اپنے وقت کے ممتاز شاعر اور صاحب قلم ادیب تھے۔ ان کی ہمہ دانی نے ان کو شہرت کے عروج پر پہنچایا۔ نثر اور نظم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی ان ہی گوناگوں خصوصیات کی جھلک ان کے اخبار "عزیز الاخبار" اور "تکمیل الاحکام" میں ہمیں نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں یہ ہفتہ وار جاری ہوا اور بہت جلد اپنی خصوصیات اور جدت پسندی کی وجہ سے عوام میں مقبول ہوا۔ یہ ہفتہ وار عزیز باغ واقع سلطان پورہ سے ان ہی کے مطبع عزیز المطابع میں چھپ کر منظر عام پر آتا تھا۔

جلوۂ محبوب حضرت عزیز جنگ ولاؔ نے تکمیل الاحکام میں جلوۂ محبوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ ایک دلچسپ گلدستہ ہے جو بیادگار جشن سالگرہ مبارک ۱۳۱۶ھ سے ماہانہ جاری ہوتا ہے جس کے لائق اڈیٹر مولوی غلام صمدانی صاحب گوہر ہیں جن کا مقام دروازہ یاقوت پورہ کے اندر نواب صاحب بینگن پلی کی ڈیوڑھی میں واقع ہے۔ یہ رسالہ متعدد حصص پر شامل ہے۔ پہلے حصہ میں سلطنت آصفیہ کی ایک مبسوط تاریخ کا سلسلہ ہے جو مستند کتب تاریخ کے داخلہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور شائستگی کے ساتھ مرتب ہوا ہے۔ کسی حصہ میں مشہور اور نامی استادوں کی شگفتہ اور منتخب غزلیں طبع ہوئی ہیں۔ اور بعض رسالوں میں طرحی مصرعوں پر شعرائے دکن کی طبع آزمائیاں ہوتی ہیں۔ ایک حصہ ہے جس میں ناولوں کا سلسلہ ہے کسی حصہ میں لطیفے اور مفید عام مضامین غرض مجموعی اعتبار سے یہ رسالہ دلچسپ اور مفید ہے۔"

اس رسالہ میں ناول کے علاوہ سوانح عمری، علمی مضامین اور تاریخی حالات بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ رسالہ پانچ سال جاری رہا اور ماہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ سے شائع ہونا موقوف ہوا۔ اور ہفتہ وار اس کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔

محبوب الکلام ۱۳۱۶ھ میں زیر ادارت فصاحت جنگ جلیل، محبوب الکلام ماہانہ جاری ہوا۔ اس رسالہ میں حضور نظام، مہاراجہ کشن پرشاد اور دیگر شعرا کا کلام شائع ہوا کرتا تھا۔

نسیم دکن ۱۳۱۹ھ سے زیر اہتمام مولوی نادر علی برتر شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں مضامین، غزلیات اور ناول بالاقساط شائع ہوا کرتے تھے۔ اس رسالہ کو راجہ لچھمن راؤ مہاراجہ رایاں بہادر امانت ونت کی سرپرستی حاصل تھی، اور امانت پریس میں چھپ کر انجمن محبوبیہ شاہ علی بنڈہ سے جاری ہوتا تھا۔

افسانہ و دکن ریویو ۱۳۲۱ھ سے مولوی ظفر علی خاں نے جاری کیا۔ دکن ریویو افسانہ کا جزو ہوا کرتا تھا۔ چار سال بعد یہ رسالہ بند کر دیا گیا اور ماہ جنوری ۱۹۰۶ء سے بمبی سے پھر شائع ہونے لگا۔ اور دکن ریویو کو افسانہ سے جدا کر دیا گیا۔ چند ماہ کے بعد دوبارہ حیدرآباد سے جاری ہوا۔ افسانہ کے بند ہونے کے بعد دکن ریویو عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ ظفر علی خاں کے بعد اس کے ایڈیٹر و مالک مولوی مودود احمد صاحب تشنہ قادری ہو گئے تھے۔

دکھنی یکم محرم ۱۳۲۱ھ میں دکھنی زیر ادارت مولوی عبد الرحیم وکیل جاری ہوا۔ یہ ایک سیاسی ہفت روزہ تھا۔ ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ سے شائع ہونا بند ہوا۔

الہادی ۱۳۲۳ھ سے مولوی غلام حسین داد نے مذہبی رسالہ جاری کیا۔ اس میں حدیث و فقہ کے مسائل کا خلاصہ ہوتا تھا۔

صحیفہ اردو کے نامور شاعر سید رضی الدین حسن کیفی نے ۱۹۰۵ء میں صحیفہ کو جاری کیا۔ مگر چند ہی ماہ کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد انجمن معارف نے دوبارہ مولوی

اکبر علی کی نگرانی میں جاری کیا۔ ۱۳۲۸ھ تک ماہوار شائع ہوتا رہا اسکے بعد کچھ عرصہ تک موقوف رہ کر ۱۳۲۹ھ سے روزانہ اخبار کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔

معیار الانشاء ماہ محرم ۱۳۲۲ھ میں سراج الدین خان کی ادارت میں شائع ہوا تلامذہ داغ کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔

اتالیق عبد الرب کوکب نے بچوں کے لئے ۱۹۰۸ء میں ایک بچوں کا رسالہ اتالیق جاری کیا۔ اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مفید مضامین ہوا کرتے تھے اس رسالہ کی افادیت کے مدنظر سرکار نے درس گاہوں میں اس رسالہ کو جاری کرنے کی اجازت دی تھی۔ اخلاقی اور اصلاحی و معلوماتی مضامین کی وجہ سے اتالیق بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول رہا ہے۔ اتالیق کی تاریخ صحافت حیدرآباد میں یہ بھی اہمیت ہے کہ اس کی وجہ سے بچوں کے رسائل کی ابتدا ہوئی

ادیب الاطفال اتالیق کے بعد حیدرآباد سے بچوں کے لئے جاری ہونے والا دوسرا رسالہ ادیب الاطفال ہے۔ مولوی احمد اللہ بیگ نے ۱۹۱۱ء میں اس رسالہ کو جاری کیا ایک سال بعد ۱۹۱۲ء میں رگھوناتھ راؤ درد اس کے ایڈیٹر رہے اور چند سالوں تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

دکن لا رپورٹ محمد غلام اکبر خاں ۱۳۰۶ف میں حیدرآباد آئے اور پیشہ وکالت سے وابستہ ہو گئے، چنانچہ وہ تین مرتبہ مجلس وضع قوانین میں نمائندہ کی حیثیت سے شریک رہے۔ ۱۳۲۰ف م ۱۹۱۱ء میں انھوں نے دکن لا رپورٹ کے نام سے ایک قانونی ماہواری رسالہ جاری کیا۔ نواب اکبر یار جنگ کو علمی و ادبی ذوق ہمیشہ ہی سے رہا۔ ملک کے مختلف رسالوں میں وہ لکھتے رہے۔ مثلاً افسر، دلگداز، وفادار اور انتخاب لاجواب میں ان کے مضامین مدت تک شائع ہوتے رہے۔ قانون اور مذہب سے آپ کو ہمیشہ دلبستگی رہی ہے۔ دکن لا رپورٹ نے قانون کی ناقابل انکار خدمات انجام دی ہیں۔

رسالہ تاج رسالہ تاج کا پہلا شمارہ خورداد ۱۳۲۳ف م ۱۹۱۴ء فروری میں منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی ابوالوفا غلام محمد انصاری وفا تھے۔ ان کے علاوہ پنڈت رگھوناتھ راؤ درد شریک مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ سائینسی معلوماتی اور مذہبی مضامین شامل ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۱۶ء کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں اس کا دوسرا دور شروع ہوا۔ رسالہ 'تاج' اپنے وقت کا سب سے اہم ادبی رسالہ سمجھا جاتا تھا۔

المعلم مولوی محمد حسین جعفری نائب ناظم تعلیمات اور مولوی عظمت اللہ خان کی نگرانی میں ۱۹۱۴ء میں ہر ماہ شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ رسالہ مدرسہ دارالعلوم کا ماہوار رسالہ تھا۔ اس رسالہ میں اساتذہ اور طلبا کے مضامین شامل ہوا کرتے تھے جب سجاد مرزا، نائب ناظم ہوئے تو وہ اس کے نگران مقرر ہوئے۔ طلبا میں علمی اور ادبی ذوق کی تربیت میں اس رسالہ نے ایک خاص رول ادا کیا ہے۔ المعلم کی اجرأ سے درس گاہوں کے علمی رسائل کے جاری کرنے کا ایک سلسلہ بھی چل پڑا جس سے بڑے مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

محمد حسین جعفری صاحب کتاب ادیب تھے۔ ہدایت مدرسین ومفتاح التعلیم ان کی مفید کتابیں تھیں۔ انھوں نے میکنزی کی کتاب ثانوی تعلیم کا بھی ترجمہ کیا تھا جو تعلیمی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔ دوران تعلیم میں وہ آکسفورڈ اسلامک سوسائٹی کے معتمد اور پھر صدر منتخب ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں جنگ بلقان کے موقع پر چار ماہ تک انجمن ہلال احمر کی عملی طور پر معاونت کی تھی۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ سررشتہ تعلیمات سے منسلک ہو گئے۔ پروفیسر علی اکبر اس رسالہ سے عرصہ تک وابستہ رہے۔ ان کے بعد مولوی سجاد مرزا، حیدرآباد کے ماہرین تعلیم میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے تعلیم کو عام کرنے اور معیار کو بلند کرنے کے لئے نئی نئی تجاویز کو پیش کیا اور انھیں روبہ عمل لایا۔ سجاد مرزا کی سرپرستی نے المعلم کے معیار کو یقیناً

بلند کیا۔ المعلم حیدر آباد سے شائع ہونے والے رسالوں میں سب سے زیادہ پابند رسالہ تھا اور طویل عرصہ تک علم و ادب کی خدمات انجام دیتا رہا۔

رسالہ افادہ مطبع اختر دکن افضل گنج سے چھپ کر مرزا نظام شاہ لبیب کی زیر ادارت محبوب پورہ سے ہر ماہ شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں اخلاقی علمی اور ادبی مضامین بچوں اور خواتین کے لئے بھی خصوصیت سے شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں رسالہ افادہ جاری ہوا، اسی زمانہ میں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی ابتدا کی تھی۔ اور اس کے صدر نواب عماد الملک اور سید حسین بلگرامی تھے۔ افادہ نے اس انجمن کی تائید میں اداریہ لکھے اور مضامین بھی۔ اور ہم عصر "مشیرِ دکن" نے جب اردو زبان کی مخالفت کی تو اردو اور حیدر آباد کے زیر عنوان مضمون شائع کیا گیا۔

"ہم عصر مشیر دکن ایک عرصہ سے اردو کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے اگرچہ بمقابلہ تحریرات کے اب ہم عصر مذکور کے مطالبات زیادہ متین اور مختصر ہو گئے ہیں تاہم وہ ملک دکن میں ایک ملکی زبان کے عام ہونے اور اقوام دکن کے ایک زبان کی وجہ سے ایک متحدہ قومیت کی شکل حاصل کرنے کا روادار نہیں ہے۔

(ماہ نامہ "افادہ" ستمبر ۱۹۱۶ء)

اس اقتباس سے شاہ لبیب کی اردو دوستی ظاہر ہوتی ہے اور دکن میں رہنے والے مختلف المذاہب افراد کے درمیان اتحاد اور محبت کی اہمیت پر بھی وہ زور دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ رسالہ افادہ کی یہ کوشش جو اس نے اردو کو عام کرنے کے لئے انجام دی ہیں، اردو زبان کی تاریخ میں بھلائے نہیں جائیں گی۔

رسالہ ذخیرہ ذخیرہ کی اشاعت ہوش بلگرامی کی ادارت میں ۱۹۱۵ء میں عمل میں آئی۔ اور یہ ماہنامہ ۱۹۱۸ء تک بڑی کامیابی

سے نکلتا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں جب انھیں شہر بدر کیا گیا تو لازماً ذخیرہ بھی بند ہو گیا۔ اس ماہنامہ کو دکن اور ہندوستان کے سبھی اہم اہل قلم حضرات کا تعاون حاصل تھا۔

ثمرۃ الادب انجمن ثمرۃ الادب نے ۱۹۱۸ء میں جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر عبدالواسع صفا تھے۔ ایک علمی اور تعلیمی رسالہ تھا۔

رسالہ النسأ صغرا ہمایوں مرزا نے ۱۹۱۹ء میں النسأ جاری کیا۔ یہ ایک نسوانی رسالہ تھا۔ جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ جب صغرا ہمایوں مرزا دورۂ یورپ کے لئے نکلیں تو یہ مفید پرچہ بند ہو گیا۔

نونہال طلبا کے لئے نکلنے والے رسائل میں نونہال کو خاص اہمیت حاصل ہے غوث الدین صاحب نے ۱۹۲۰ء میں دفتر نونہال چیلہ پورہ سے جاری کیا تھا۔ نونہال نے بچوں میں زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ عرصہ دراز تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ یہ بھی اپنے زمانے کا مقبول رسالہ تھا۔

رسالہ نمائش مرزا رفیق بیگ نے ۱۹۲۲ء میں ایک صنعتی رسالہ جاری کیا اس میں صنعت و حرفت کے علاوہ ادب سے بھی متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے نکالنے والوں میں مرزا الم نشرح (مرزا فرحت اللہ بیگ) کا نام خاصہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ کوئی سات سال تک علم و صنعت کی خدمت کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں بند ہو گیا۔

لسان الملک سید محمد ضامن کنتوری نے ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد سے رسالہ لسان الملک جاری کیا۔ اس سے قبل بھی سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے رائے بریلی سے رسالہ استعار جاری کیا تھا۔ نواب عماد الملک کی وجہ سے یہ سررشتہ تعلیمات میں ملازم ہو گئے تھے۔ اور بعد میں دار الطبع سرکار عالی میں منتظم کی حیثیت سے منتقل ہو گئے تھے۔ حضرت حبیب اور جناب عدیل سے

فن شعر میں مشورہ لیتے رہے، پھر مولانا اشہری کی صحبت میں نثر نگاری اور اخبار نویسی کا شوق و ذوق پیدا ہوا۔ انگریزی زبان پر انھیں بڑا عبور حاصل تھا۔ انھوں نے انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا تھا جو ارمغانِ فرہنگ کے نام سے شائع کیا۔ آوارہ وطن اور اعظم الفوائد بھی ان کی تصانیف ہیں۔ لسان الملک کے اجرا کی جب انھیں اجازت ملی تو اس مسرت میں انھوں نے ایک منظوم رقعہ منظر علی اشہری صاحب منظر الکرام کے نام لکھ بھیجا، چند شعر نقل ہیں ؎

اے منظرِ اشہر لقب، اے یادگار اشہری
اے سید والا نسب، اے ماہ چرخ برتری
اے وہ کہ ہے تیرا قلم بس تازہ کار و تازہ دم
ہے تیرا انداز رقم، دستور معنی پروری
رفتار مستانہ تری، صورت فقیرانہ تیری
باتیں حکیمانہ تری اللہ اے شان دلبری
ہفتوں نہ ملنا یوں تیرا کس قدر ہمت رہا
اشہر! خدارا جلد آ، اچھی نہیں عشوہ گری
بھیا اجازت آچکی تیرے لسان الملک کی
اب راہ پیدا کر کوئی ایسی ہو جس میں بہتری

رسالہ ترقی ۱۹۲۳ء میں یہ رسالہ ابوالمکارم محمد انوار اللہ کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں ٹھوس اور معیاری مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ عرصہ تک یہ رسالہ علم و ادب کی خدمات کرتا رہا، علمی حلقوں میں رسالہ ترقی کو کافی مقبولیت حاصل تھی۔

رسالہ تحفہ انجمن اربابِ اردو کا یہ آرگن تھا۔ ثمرۃ الادب کی طرح اس انجمن نے بھی اردو صحافت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

ارباب اردو کے شعبوں کے منجملہ ایک شعبہ یہ رسالہ تحفہ بھی تھا۔ اس انجمن کے معتمد محب اللہ عالی اس رسالہ کے ایڈیٹر تھے اور دوار کا پرشاد نگم مہتمم ادارہ ورسالہ تھے۔ ۱۹۲۳ء سے رسالہ تحفہ کی اجرائی عمل میں آئی۔ اور ایک سال کی قلیل مدت ہی میں بند ہوگیا۔

ارشاد پیرزادہ شاہ یوسف الدین قادری مرحوم نے ۱۹۲۷ء میں ارشاد جاری کیا۔ جنوبی ہند کا یہ قدیم ترین اصلاحی وادبی جریدہ تھا۔ حکومتِ نظام میں یہ امور مذہبی اور تعلیمات میں سرکاری طور پر خریدا جاتا تھا۔ یوسف الدین صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پیرزادہ جاوید قادری اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ افراط و تفریط اور غلو سے بچتے ہوئے اصلاحی وافادی نقطۂ نظر اختیار کیا۔ کبھی بے باک اداریوں کے لئے شہرت رکھتا تھا۔ مذہبی پہلو کو باقی رکھتے ہوئے اسے عقلی و سائنٹیفک موڑ مروج کیا۔ قومی، سیاسی، تاریخی اور ادبی عنوانات کے تحت دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ماہانہ طرحی مشاعرہ، اردو کا محاذ، نقد ونظر اور اپنے مخصوص ڈھنگ کے مذہبی مضامین کے لئے ارشاد نے پڑھنے والوں کا حلقہ پیدا کرلیا۔ (عرصہ سے یہ رسالہ شائع نہیں ہورہا ہے)

رسالہ تاریخ شمس اللہ قادری اپنی تاریخی اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے شمس المورخ کہلاتے تھے۔ انھوں نے جون ۱۹۲۹ء میں رسالہ تاریخ جاری کیا۔ اس رسالہ میں تاریخ اور ادب سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ رسالہ تاج میں اردوئے قدیم کے عنوان سے تحقیقی ولسانی مضمون لکھ کر کافی شہرت حاصل کی تھی۔ رسالہ تاریخ بھی ان کی تحقیقی اور تاریخی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ یہ سہ ماہی رسالہ تھا۔ اس رسالہ کی قیمت دو روپے تھی۔ یہ رسالہ نواب لطف الدولہ اورنٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے شائع ہوتا تھا۔ اب بھی یہ انسٹیٹیوٹ میں ان کے صاحبزادے احمد اللہ قادری کی نگرانی میں اشاعت کا کام ہورہا ہے۔ احمد اللہ قادری اس رسالہ

کے سب ایڈیٹر تھے۔ احمد اللہ قادری کی تصانیف کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان کے تحقیقی اور علمی کارناموں کے پیش نظر حکومت ہند نے انھیں پدما شری کا خطاب خطاب دیا ہے۔ رسالہ تاریخ میں حکیم شمس اللہ قادری کے علاوہ دیگر ادیبوں اور مورخوں کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ موضوعات کے اعتبار سے "تاریخ" وقیع رسالہ تھا۔

مجلہ عثمانیہ پہلے پہل ۱۹۳۶ء میں طلبہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے سہ ماہی رسالہ جاری ہوا اور اس میں اساتذہ اور طلباء کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ معین الدین قریشی جو محقق اور صحافی کی حیثیت سے حیدرآبادی حلقوں میں کافی نام پیدا کیا تھا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے تعاون سے یہ رسالہ جاری کیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ رسالہ سالنامہ ہو گیا۔ مجلہ عثمانیہ کے جو طلبا بھی ایڈیٹر رہے، انھوں نے آگے چل کر صحافت اور ادب کی گراں قدر خدمات کی وجہ سے صحافت و ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

مکتبہ مکتبۂ ابراہیمیہ کی جانب سے یہ رسالہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ چونکہ اس مجلہ کی مجلس ادارت میں جامعہ کے پروفیسرز اور اساتذہ صاحبان کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے مکتبہ کو نوجوان ادیبوں کا بھی تعاون عمل حاصل رہا۔ مکتبہ نے دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ جدید اور نئی صنف افسانہ کی ترقی اور مقبولیت میں غیر معمولی حصہ ادا کیا ہے۔ عبدالقادر سروری اس کے مدیر اور جناب سید محمد صاحب اور عمر یافعی شرکا کی حیثیت مکتبہ کے معیار میں اضافہ کرنے کی سعی کامیاب کی ہے۔

ہمجولی بیگم ابوبکر خوشیگی کی ادارت میں ۱۹۳۱ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اپنے پیشرو نسوانی رسائل کی طرح ہمجولی نے تحریک نسواں کو تقویت بخشی ہے۔ مدیرہ کی شبانہ روز محنت اور دلچسپی نے اس رسالہ کو

بہت جلد مقبول بنا دیا۔ یہ خواتین دکن کا پسندیدہ رسالہ تھا۔ جس میں تعلیم اور امور خانہ داری سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ دو سال کے بعد ہی یہ رسالہ بند ہو گیا۔

رسالہ شہاب

عبدالرزاق بسمل ادیب بھی تھے، اور شاعر و افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے "شہاب" جاری کر کے صحافی ہونے کا ثبوت دیا۔ اس رسالہ میں "ناہید" کے نام سے عورتوں کے لئے چند صفحات مختص کر دیئے گئے تھے۔ ان صفحات پر خواتین کے مضامین اور افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اور ایک زمانہ تک جاری رہنے کے بعد عبدالرزاق بسمل کے انتقال کے کچھ عرصہ پہلے ہی بند ہو گیا۔ اس رسالہ میں ج نقوی، حجاب وغیرہ کے افسانے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ اکثر مضامین اور افسانے الاہرام سے بھی ترجمہ ہوا کرتے تھے۔ اکثر مضامین کا ترجمہ مولوی حسن محی الدین صاحب غیرت نے کیا ہے۔ مولوی حسن محی الدین صاحب اس وقت راقم الحروف کے ساتھ گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں شعبہ عربی کے ریڈر تھے۔ آپ حیدرآباد کے عالم مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور فن شاعری میں عبور رکھتے ہیں۔

سب رس

حیدرآباد کے ادبی رسائل کی تاریخ میں سب رس کی اشاعت کو خط فاصل سمجھنا چاہیئے۔ ادارہ ادبیات کی جانب سے پہلی بار ۱۹۳۸ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے ایڈیٹران اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور رہے تھے۔ حمید الدین شاہد، میکش حیدرآبادی، پروفیسر علی اکبر، اکبر الدین صدیقی اور خلیل اور غلام جیلانی اس رسالہ سے وابستہ رہے ہیں۔ پروفیسر سید علی اکبر ماہرین تعلیم میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اکبر الدین صدیقی صاحب ان لوگوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی شب و روز کی محنت سے

ادارہ کو تحریک میں بدل دیا ہے۔ ان دنوں مغنی تبسم معتمد کی حیثیت سے کارگذار ہیں جب کہ مجلس مشاورت میں گوپی چند نارنگ، غلام عمر خاں، رمن راج سکسینہ، عابد علی خاں اور محمد منظور احمد شامل ہیں۔

ادارہ سے بچوں کا سب رس بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ عبدالحفیظ صدیقی کی تحریک پر سیاست اور حالات حاضرہ سے متعلق ایک اور رسالہ سب رس معلومات بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ دو سال کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

ہندوستانی ادب

۱۹۳۹ء میں پہلی بار غلام محمد خاں نے اس رسالہ کو جاری کیا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اردو الفاظ کو صوتی بنیاد پر لکھنے کی تحریک و تجویز پیش ہوئی تو اس رسالہ نے اس تحریک کو قبول کیا۔ چنانچہ صوتی بنیادوں پر ہی املا لکھا جاتا رہا۔

پرچم

فصیح الدین احمد صاحب کی ادارت میں ہفتہ وار 'پرچم' ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ ۱۹۴۸ء سے پہلے کی سیاسی انقلاب کے زمانہ میں پرچم جذباتی نقطۂ نظر کا علم بردار بن گیا تھا۔ اور آزاد حیدرآباد کی تحریک کو عام کرنے کی کوشش کی۔ فصیح الدین احمد کے ساتھ جامعہ کے اکثر نوجوان وابستہ تھے۔ ابراہیم جلیس اور عبدالرزاق لاری، ان میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ابراہیم جلیس کے مضامین عام طور پر پسندیدہ نظروں سے پڑھے جاتے تھے ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات کے نتیجہ میں پرچم بند ہو گیا پرچم نے جذباتی لیڈرشپ کی تائید کر کے صحافت میں جذباتی اندازِ نظر کو ہوا دی ہے

مملکت

میر حسن الدین نے ۱۹۴۰ء میں مملکت کے نام سے ہفتہ وار رسالہ جاری کیا تھا جو دس سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ مملکت اپنے وقت کا اہم رسالہ تھا اور اس کے پڑھنے والوں کا ایک خاص حلقہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ موضوعات کے اعتبار سے یہ ایک سیاسی رسالہ تھا جس میں سنجیدہ مسائل پر بحثیں ہوتیں۔ فلسفیانہ مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ اکثر ریاستی مسائل پر بھی مضامین

شامل رہا کرتے تھے ۔ وفاق اور ریاستیں کے عنوان سے شہاب الدین صاحب کا مضمون جب پیام میں شائع ہوا تو یہ مضمون اس وقت کا کہیں زیادہ نزاعی بن گیا تھا۔ یہ مضمون در اصل حسن الدین صاحب کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ مملکت پیام کا ہم عصر تھا اور رقیب بھی ۔ دونوں میں کافی نوک جھونک ہوا کرتی تھی ۔

میر حسن الدین کا شمارہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور سے ہے ۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم ، اے کی ڈگری حاصل کی ، وہ نہایت قابل صحافی تھے اور اس وقت کی ملکی اور غیر ملکی سیاست سے وابستہ تھے "جمعیت رعایا نظام" ایک سیاسی انجمن تھی ، جس کا مقصد جمہوری نظام کا قیام تھا۔ حسن الدین صاحب کے علاوہ یم نرسنگ راؤ اور علی یاور جنگ بھی اس انجمن سے وابستہ تھے ۔ اس زمانہ میں وفاق کا ایک سلسلہ بھی شروع ہوا تھا ۔ ۱۹۳۸ء ایکٹ کے تحت حسن الدین صاحب ریاستوں کے حقوق قائل تھے ۔ اور وہ حیدر آباد کو خود مختار ریاست سمجھتے تھے ۔ ان کے کئی مضامین رُعیتؔ میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ وہ ہندو مسلم کے حامی تھے ۔ چونکہ وہ بے غرض اور صاف گو آدمی تھے اس لئے سیاست کے میدان میں جم نہ سکے ۔

مملکت اپنے "نمک پارے" کی وجہ سے بھی مشہور تھا ۔ طنز و مزاح کے یہ کالم حسن الدین صاحب ہی کے قلم کے رہین منت تھے ۔ مملکت میں اقبالؒ کے توسیع لکچرز کا ترجمہ بھی شائع ہوتا تھا ۔ ان لکچرز کا ترجمہ حسن الدین صاحب ہی کرتے تھے ۔

داستان گو مکتبہ ، مشاعرہ (نور اللہ ، محمد غوری) ، خلیق (امام بیگ رولق) تحفہ ، شہاب ، آئینہ ادب (مونس احمد) ہزار داستان (ابوالمعانی وصف) اور ارم (ارشاد محمد خاں) کی طرح داستان گو بھی حیدر آباد کا ایک معیاری رسالہ رہا ہے ۔ ۱۹۴۱ء میں داستان گو کو علی احمد نے جاری کیا ۔ اس زمانہ کے تقریباً سبھی نئے لکھنے والے داستان گو میں چھپتے رہے ہیں ۔ داستان گو نے افسانوی ادب کی توسیع میں نمایاں کام انجام دیا ہے ، عبد الحلیم بی اے ، محمد یحییٰ

اشفاق حسین، مخدوم، عزیز الحق، وجد، سہروردی، اور سرفراز علی قلمی معاونین رہے ہیں پولیس ایکشن کے بعد علی احمد پاکستان منتقل ہوگئے۔ جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ معاصر روزنامہ سیاست نے ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۰ء کے اخبار میں ان کے انتقال کی خبر شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مرحوم دکن ریڈیو سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ وہ ع احمد کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد سے داستان گو کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جو بے حد مقبول تھا۔"

صحت عامہ

رسالہ طبابت کے بعد طبی اور سائنسی رسائل کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی رہی، ایک طویل مدت کے بعد لئیق احمد نعمانی نے سنہ ۱۹۴۱ء میں رسالہ صحت عامہ نکالا۔ اس میں طب اور حفظان صحت سے متعلق مضامین ہوا کرتے تھے۔

جیت

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار مرزا عظمت اللہ بیگ یوں تو دلی کے رہنے والے تھے لیکن اس زمانہ میں دلی اور یوپی کے دیگر شہروں اور بستیوں کے اکثر و بیشتر گھرانے حیدرآباد میں تلاش روزگار کی خاطر آکر بس گئے تھے۔ اسی طرح عظمت اللہ بیگ بھی ابتدائے عمر ہی میں حیدرآباد آئے۔ انھوں نے چادر گھاٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور دار الطبع جامعہ عثمانیہ کے صیغہ بلاک سازی میں مامور ہوگئے۔ عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ علوم نجوم سے بھی دلچسپی تھی لیکن وہ مزاح نگار کی حیثیت سے چمکے۔ عظمت اللہ بیگ نے جنگ فنڈ حکومت حیدرآباد کی اعزازی کمیٹی کی طرف سے فوجیوں کی دلچسپی کے لئے اگسٹ سنہ ۱۹۴۳ء میں ایک ماہنامہ رسالہ "جیت" نکالا جو چار سال تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا، آخری زمانہ میں ایک مزاحیہ رسالہ "تماشا" بھی نکالنے لگے تھے۔ جو ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے صبغۃ اللہ بیگ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ مرحوم کی تصانیف میں مولانا روم کی کہانیاں، چچا سعید کی کہانیاں، آسماں کے بھید، پر بدو

کے بھید، پرندوں کی دنیا، ہمارا ہندوستان، ملا نصیر الدین، دادا لال بجھکڑ، راجہ بیربل، اسیپ کی کہانیاں، گدھے کی عقلمندی اور کاک ٹیل وغیرہ شامل ہیں۔

ہماری کتابیں انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک مفید رسالہ "ہماری کتابیں" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اس رسالہ کے ایڈیٹر سید علی شبیر ہاشمی تھے۔ دیدہ زیب ہمہ رنگی ٹائٹل کے ساتھ اس رسالہ کی قیمت صرف ۲ آنہ سکہ حالی تھی۔ جب یہ رسالہ جاری ہوا۔ اس زمانہ میں انجمن کے صدر اکبر یار جنگ تھے۔ "ہماری کتابیں" ایک معیاری اور ادبی رسالہ تھا۔ اس میں مضامین و مقالات، قابل مطالعہ کتابیں علمی استفسارات، تبصرہ و تذکرہ، تعارف، علم کتب خانہ، تکملہ وغیرہ مستقل موضوعات تھے، جن کے ماتحت مختلف ادیب مختلف ادیبوں اور شاعروں اور ان کی تصانیف اور ادبی مسائل کے بارے میں تنقیدیں کرتے اور تفصیلات بہم پہنچاتے تھے۔ "ہماری کتابیں" کے لکھنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا، رموزی عبدالقدوس ہاشمی، الف، ایم، قدسی، سید محمد، نظر حیدر آبادی، ناطق لکھنوی، نواب بہادر یار جنگ، مبارز الدین رفعت، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، احمد مکی اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ شامل ہیں۔

رہبر وطن "رہبر وطن" ہفتہ وار اخبار تھا جو مولوی سید مصطفٰے قادری خطیب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ مولوی صاحب ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے اور جامعہ نظامیہ سے انھوں نے منشی کا امتحان پاس کیا تھا۔ خیالات کے اعتبار سے مولوی صاحب کانگریسی واقع ہوئے تھے اور انھوں نے ۱۹۲۱ء میں وامن نائک کے زیر قیادت عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں خلافت تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اور بعد میں یہ کانگریس کے لئے کام کرتے رہے اس وجہ سے انھیں تین مرتبہ جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ خطیب کی سوروثی معاش اور مسجد وار انتفاع کی

خطابت سے بھی دست بردار ہونا پڑا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں مولوی صاحب نے وطن نیوز ایجنسی قائم کی اور اسی زمانہ میں رہبر وطن جاری ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ہمدم، روزنامہ جاری ہوا جو بعد میں ان کے انتقال ۱۹۷۳ء تک یہ کبھی پابندی سے اور کبھی غیر پابندی سے جاری رہا۔

رباب محمد عثمان اور حسینی شاہد کی ادارت میں رباب ۱۹۴۶ء جاری ہوا۔ دیدہ زیب سرورق اور معیاری مضامین کی وجہ سے بہت جلد ادبی حلقوں میں رباب نے اپنا مقام بنا لیا تھا۔ رباب کے مضامین کا جھکاؤ بڑی حد تک ترقی پسندی کی طرف تھا۔ مختصر سے عرصہ ہی میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

داستان ۱۹۴۶ء میں احمد مکی نے داستان جاری کیا۔ ان کے ساتھ زینت ساجدہ بھی شریک کار تھیں۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ معیاری رسالہ بند ہو گیا۔ اور اسی کے بعد احمد مکی نے فلمی رسالہ فلم زار جاری کیا۔

ایوان مختار احمد کرمانی نے ایوان ۱۹۴۷ء میں جاری کیا۔ شفیع اختر مہتمم تھے۔ بعد میں احمد مکی بھی اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔

سویرا سویرا ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ فروری ۱۳۵۶ف مطابق فروری ۱۹۴۷ء دکن بک ڈپو عابد روڈ سے غوث محی الدین نے جاری کیا تھا اس کی پیشانی پر مخدوم کا یہ شعر جلی حروف میں لکھا ہوتا ؎

حیات لیکے چلو کائنات لیکے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لیکے چلو

سویرا کے پہلے شمارہ میں تقریباً سبھی سربرآوردہ ترقی پسند ادیب و شاعر شامل تھے مثلاً علی سردار جعفری، پریم دھون، مخدوم محی الدین، کیفی، ل احمد، قاضی عبدالغفار، عابد علی خاں، وہاب حیدر، امجد یوسف زئی۔ ان کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم، اختر ہوشیارپوری۔ نظر حیدرآبادی، رونق ظہیر، فراق، وامق، کنول

پرشاد کنول، سردار الہام، ہیکش، تحسین سروری، وی وا پھڑنویس، صدیقہ بیگم اور افضل عابدی کے بھی رشحات قلم شامل تھے۔ ان ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ عالم خوندمیر، عزیز احمد، انور، حمید اختر، گنپت شرما۔ غلام ربانی تاباں، منظور حسین شور، لطیف ساجد، عمران انصاری، نازش پرتاب گڈھی۔ پرویز، لطیف انور، شاہد صدیقی، علی جواد رضوی، محمود غزالی۔ اثر مجیدی، قدوس صہبائی، ملک راج آنند، ازمیر احمد شباب نقوی، متین سروش، ابن انشا، محبوب حسین جگر، سہیل افندی۔ یونس احمد سلطان تیمور، ساحر لدھیانوی، وحید یوسف زئی۔ محمد مہدی، حمید اختر، وغیرہ کے نام بھی سویرا کے لکھنے والوں میں شامل ہے۔ مضامین اور نظموں کے علاوہ افسانے بھی شامل ہوا کرتے تھے

الہدیٰ

الہدیٰ ۱۹۴۷ء میں ہر پندرہ روز کے بعد شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر عبدالحمید خان تھے۔ ۱۹۵۰ء میں اس رسالہ سے عابد انصاری (ایڈیٹر پرچم) بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ تین سال تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مولوی عبدالحمید خان صاحب کے انتقال کی وجہ سے بند ہو گیا۔ الہدیٰ نے اپنے مخصوص لب و لہجہ اور بے باک اظہار رائے کی وجہ سے حیدرآباد کے ادبی و سیاسی حلقوں میں وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

عطارد

خواجہ معین الدین انصاری کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا اور جلد ہی بند بھی ہو گیا۔ عابد انصاری نے الہدیٰ سے تعلق پیدا کیا۔

تارے

بچوں کا معیاری رسالہ تھا جو مسلم ضیائی کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد بھی یہ رسالہ شائع ہوتا رہا لیکن جب مسلم ضیائی پاکستان منتقل ہو گئے تو بچوں کا یہ محبوب اور دلپسند رسالہ بند ہو گیا۔

سنگم

نظر حیدرآبادی اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ یہ ممتاز شاعر علی اختر کے صاحبزادے تھے۔ پولیس ایکشن سے قبل ۱۹۴۷ء میں انھوں نے سنگم جاری کیا تھا۔ پرچم کی طرح سنگم بھی نیم سیاسی رسالہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں

پاکستان منتقل ہوجانے کی وجہ سے سنگم کی اشاعت مسدود ہوگئی۔

مینا تمکین کاظمی حیدر آباد کے مشہور انشا پرداز تھے۔ مختلف اخباروں اور رسالوں سے وہ وابستہ رہے۔ خود بھی "مینا" کے نام سے اپنا ایک ماہنامہ ۱۹۴۷ء میں جاری کیا تھا، جو مختصر سی مدت کے بعد ہی بند ہوگیا۔

آہنگ خورشید احمد جامی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوا کرتا تھا۔ آہنگ ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ تھا۔ مجلس ادارت سے امیر احمد خسرو بھی وابستہ تھے۔

بچوں کی دُنیا ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں اظہر افسر کی ادارت میں بچوں کا رسالہ "بچوں کی دنیا" جاری ہوا۔ یہ بچوں کا ایک باتصویر رسالہ تھا۔ موٹی کتابت کے ساتھ مختلف رنگوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔

نیا دور اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر اور کمیونسٹ لیڈر مخدوم محی الدین نے ۱۹۵۱ء میں نیا دور جاری کیا تھا۔ اور یہ ہفتہ وار بھی مختصر سی مدت کے بعد ہی بند ہوگیا

معمار جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ چند نوجوانوں نے جناب خلیل اللہ حسینی کی صدارت میں بزم احباب قائم کی۔ اس بزم کے قیام کا مقصد نوجوانوں میں صنعتی اور تجارتی رجحان پیدا کرنے اور اصلاح و تعمیر بھی تھا۔ بالخصوص مسلمانوں میں ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات میں جو ذہنی پستی پیدا ہوگئی تھی اس پستی سے نجات دلانا اور از سر نو سماج کی تعمیر میں بزم احباب نے نمایاں کام انجام دیا ہے۔ آگے چل کر یہی بزم تعمیر ملت کے نام سے سرگرم عمل ہوگئی ہے۔ بزم احباب کا دفتر ترپ بازار میں تھا، اسی زمانہ میں بزم کی جانب سے 'معمار' ہفتہ وار جاری کیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر غوث خاموشی اور مینجنگ ایڈیٹر مظہر قادری تھے۔ اس کے علاوہ ظفر عالمگیر، مصباح الدین شکیل، صابری انصاری، حسن حیامت، ابراہیم پرواز مجلس ادارت

یں شامل تھے۔ فیض زبیری، عبدالرزاق لاری، رحیم قریشی، قیوم نادان، سکندر، رفیعہ رؤف اور زبیدہ انصاری، قلمی معاونین کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کے علاوہ صحت مند اور تعمیری نقطہ نظر کے حامل ادیبوں اور شاعروں کے مضامین اور افسانے اس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ معمار میں بچیوں اور بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ صفحہ بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد معمار بند ہوگیا۔ ان دنوں تعمیر ملت کے دفتر مدینہ منشن نارائن گوڑہ سے رحیم قریشی کی ادارت میں "شعور" ہفتہ وار شائع ہو رہا ہے۔ مضامین کی نوعیت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ معمار کے سلسلہ خیالات کو شعور نے بھی جاری رکھا ہے۔ اور اب یہ ہفتہ وار بھی بند ہو چکا ہے۔

عکس — عکس ۱۹۵۲ء میں مس محمودہ یاسمین کی ادارت میں گوشہ محل سے جاری ہوا تھا۔ "سیوا" ہی کی طرح یہ بھی نئے ادب کا ترجمان تھا۔ محمودہ یاسمین خود بھی اپنے دور کی اچھی افسانہ نگار تھیں۔ اس لئے عکس کو بھی افسانہ کے ارتقا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ قدیر ظفر کی معاونت حاصل تھی۔ قدیر ظفر محمودہ کے بھائی ہیں۔ نامساعد حالات کی وجہ سے "عکس" زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ ان ہی ناگفتہ بہ حالات ہی نے محمودہ یاسمین کی زندگی کو ایک افسانہ بنا دیا ہے۔ افسانہ نگاری کو انھوں نے اب ترک کر دیا ہے اور اب پالی ٹکنیک کالج میں کام کرتی ہیں۔

شعور — اختر جہاں کی ادارت میں "شعور" جاری ہوا۔ مغنی تبسم، خورشید نذیر اور ڈاکٹر غیاث صدیقی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ شعور علمی و ادبی ترجمان تھا۔ اختر جہاں شعور کے بند ہونے کے بعد ایک طویل عرصہ تک خاموش رہیں۔ اور کچھ عرصہ بعد مغنی تبسم ہی کی معاونت ہی سے "شعر و حکمت" (سہ ماہی) جاری ہوگیا۔ مجلس ادارت میں مغنی تبسم کے علاوہ شہریار (علی گڈھ) بھی شامل تھے۔

نوخیز منیر صفوی کی ادارت میں بچوں کے لئے رسالہ "نوخیز" ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا۔ تارے کے بند ہوجانے کے بعد بچوں کے ادب میں جو خلا محسوس کیا جارہا تھا، نوخیز کی اجرا سے اس کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی۔ نوخیز سے انوارالحق بھی وابستہ تھے۔ اس میں دلچسپ کہانیاں، نظمیں اور لطیفے شائع کرتے تھے۔ نوخیز حیدرآباد سے نکلنے والا بچوں کا معیاری رسالہ تھا۔

گلشن محمود انصاری کا حیدرآباد کے ذہین نوجوانوں میں شمار ہوتا ہے۔ گو یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے طالب علم ہیں، لیکن بچپن ہی سے ادب اور صحافت کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ تارے اور نوخیز میں ان کی بیشتر کہانیاں شائع ہوئیں اور خود بھی ۱۹۵۴ء میں اپنا رسالہ گلشن جاری کیا، جو حیدرآباد کے باہر بھی بچوں میں بے حد مقبول ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں گلشن کے بند ہونے کے بعد کاکل جاری کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد ہفتہ وار رسالہ تھا۔ اس میں ادب و سیاست سے متعلق مضامین اور اداریئے شامل ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء تک کاکل محمود انصاری کی ادارت میں نکلنے کے بعد احمد جلیس نے کچھ عرصہ تک کاکل کو جاری رکھا۔ اب یہ رسالہ موقوف ہوگیا ہے۔ محمود انصاری عرصہ تک روزنامہ سیاست سے وابستہ رہنے کے بعد اب خود اپنا اخبار روزنامہ "منصف" جاری کیا۔ اور مختصر سے عرصہ میں اپنا منفرد مقام بنالیا ہے۔

بچپن اپنی نوعیت کا پہلا ہفتہ وار اخبار تھا جس میں بچوں کے لئے خبریں، مضامین، کارٹون اور لطیفے شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں موسیٰ کاظم یداللّٰہی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ دراصل "بچپن" ہماری اس "بچوں کی بزم" کا آرگن تھا جو موسیٰ کاظم صاحب کی سرکردگی میں محلہ بیگم بازار میں قائم ہوئی تھی۔ یہ ہمارے بچپن کا زمانہ ہے۔ اس بزم کے تحت تحریری، تقریری اور بیت بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ڈرامہ اسٹیج کئے جاتے تھے۔ ان ڈراموں کو موسیٰ کاظم خود

ہی لکھتے اور خود ہی ڈائرکٹ بھی کرتے تھے۔ ڈرامہ کا شوق دراصل انھیں اپنے والد جناب منجو قمر سے ملا ہے جو حیدرآباد کے مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔

بچوں کی بزمِ دکی طرف سے ٹیبل ٹینس، فٹ بال، کبڈی، اور کرکٹ جیسے کھیلوں کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ "بچپن" بھی اسی بزم کا ایک شعبہ تھا۔ بچپن کی انفرادیت ایک یہ بھی تھی کہ اس میں بچوں کے لئے معمہ بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ انعامات کی رقم ڈھ پیوں یں نہیں پیسوں میں ہوا کرتی تھی۔

گجر "گجر" ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا، جو نجم الثاقب شحنہ کی ادارت میں فروری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے ترتیب کاروں میں حسینی شاہد، سری نواس لاہوٹی اور نعمت انور بھی شامل تھے۔ اس پرچے کے دو دو ماہ کے مشترکہ تین معیاری اور ضخیم شمارے شائع ہوئے۔ اس کے لکھنے والوں میں قاضی عبد الغفار، سجاد ظہیر، عالم خوندمیری، زینت ساجدہ، نجمہ سمیع، احمد مکی، اعجاز حسین، نور الحسن ہاشمی، ظہیر الدین مدنی، اور شمیم احمد ایسے مقالہ نگار، جوش، فراق، پرویز شاہدی، نظر، اثر لکھنوی آنند نرائن ملا، مخدوم، اطہر کاشمیری، سلام مچھلی شہری رشاد عارفی، سکندر علی وجد، یعقوب عثمانی، تاجور سامری، س۔ ا۔ عشرت، ساغر نظامی، ادیب، فیض احمد فیض خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، اکبر حیدرآبادی، تحسین سروری، راہی معصوم رضا، شہاب جعفری، بلراج کومل، نریش کمار، عزیز قیسی، باقر مہدی، حمایت علی شاعر، قاضی سلیم، زبیر رضوی، رفعت سروش، کنول پرشاد کنول، جگر مرادآبادی، مجنوں، احمد ندیم قاسمی، روش، عدم، بشر نواز، متین سروش، مظہر امام، قتیل شفائی، محمد علی تاج نعمت انور، سرور ڈنڈا، اختر انصاری، اور شاذ تمکنت ایسے شعرا اور دیوندر اسر، جیلانی بانو، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، کرتار سنگھ دگل، اقبال متین، انور عظیم عصمت چغتائی، دیویندر ستیارتھی، ل احمد، امرت رائے، گجندر سنگھ، یاجرہ مسرور فکر تونسوی، ملک راج آنند، واجدہ تبسم، کشمیری لال ذاکر، اور خوش دراج رہبر جیسے

افسانہ و خاکہ نگار شامل تھے۔ یہ نام اردو ادب اردو ادب کی بجائے خود تاریخ ہیں۔ ان ناموں سے گجر کے اعلیٰ معیار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

صبا "صبا" کی اجرائی مارچ ۱۹۵۵ء سے عمل میں آئی۔ اس کے ایڈیٹر اردو کے مشہور شاعر سلیمان اریب تھے۔ اریب اس سے پہلے کئی رسائل سے وابستہ رہے۔ "سب رس"، اور "چراغ" سے بھی وہ وابستہ تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ جمہور کے ایڈیٹر ہوئے، ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ چراغ اور ۱۹۵۳ء میں سب رس کے ایڈیٹر رہے۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں ان کا انتقال ہوا تو معاصر "سیاست" نے ان کی موت پر لکھا:

"مخدوم محی الدین اور جامی کا غم ابھی تازہ تھا کہ حیدر آباد کا سخن فہم، آسمان شاعری کا ایک اور ستارۂ تابندہ سے محروم ہو گئے۔ اریب کی جوان موت کو آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔"

اریب کے انتقال کے بعد بیگم صفیہ اریب نے "صبا" کو اریب کی یادگار کے طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کی، اس کے دو شمارے بھی شائع ہوئے، لیکن اس کے بعد اس کی اشاعت مسدود ہو گئی۔

انعام وقار خلیل نے ۱۹۵۷ء میں بچوں کے لیے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا۔ ایک سال تک یہ رسالہ جاری رہا۔ بچوں کا یہ ایک معیاری رسالہ تھا[۱]۔

گذشتہ صدی کا جب ہم علمی و ادبی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تین دور صحافت کی تاریخ میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ قیام جامعہ سے پہلے کا زمانہ، قیام جامعہ کے بعد کا زمانہ اور ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلی کے بعد کا زمانہ۔ قیام جامعہ سے پہلے کا زمانہ حیدر آباد کے اردو رسائل کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس دور کی اہمیت یہی کیا

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے، "میرا شہر میرے لوگ"

کم ہے کہ اردو رسائل جاری ہوئے، مطالعہ کا شوق بڑھا اور ادبی و اصلاحی مضامین لکھنے اور پڑھنے کی ابتدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کو بھی ان رسائل کی اجرا کی وجہ سے کافی ترقی ہوئی، ورنہ اس سے قبل گلدستے شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ دور دراصل ادب و شعر کی مقبولیت کا ہے اور اسی ادبی اور صحافتی وجہ سے اس کی اہمیت بھی ہے۔
جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جو نسلیں جامعہ سے نکلیں وہ ادب، صحافت اور سیاست کے افق پر چھا گئیں۔ جدت طرازیاں ہونے نئے تجربے اور نئے نئے نظریئے عام ہوئے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ادب، صحافت اور سیاست کو اپنی جولان گاہ بنالیا۔ دراصل یہ دور حیدرآبادی اردو صحافت کا نشاۃِ ثانیہ ہے۔ مجلہ عثمانیہ کے علاوہ مجلہ طیلسانین بھی ان قابل نوجوانوں کے ادبی ذوق کا آئینہ دار رہا ہے۔ جو ۱۹۳۷ء میں جاری ہوا تھا اس تحقیقی اور علمی مجلہ کے مدیران میں ڈاکٹر زور، مجید صدیقی، غلام دستگیر رشید، مہندر راج سکسینہ، سید محمد، محمد غوث، اکبرالدین صدیقی۔ انوار اللہ وغیرہ شامل تھے۔ ان علمی رسائل کے علاوہ خود عام لوگوں کے لئے کئی ہفتہ وار ماہنامے، سہ روزہ، پندرہ روزہ اور سالنامے جاری ہوئے اور کئی روزنامے بھی۔ ان تمام اخباروں اور رسائل سے یہی نوجوان وابستہ تھے۔ ان میں "مجلسی" رضاکار بھی تھے اور قوم پرست کانگریسی بھی، اور ان میں "ترقی پسند" بھی تھے اور قدامت پسند بھی۔ کئی قافلے تھے جو بیک وقت بڑھ رہے تھے۔ جوش و خروش بھی اس دور میں ملتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی سنجیدگی اور متانت بھی، تدبیر و فراست بھی ملتی ہے۔ اندھی تقلید کی سیاہ کاریاں بھی۔ اردو صحافت کی تاریخ کا یہ سب سے زرین دور تھا اور اپنی نوعیت کا بدترین زمانہ بھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے رسائل ہر قسم کے رجحانات اور میلانات کا سرچشمہ بن گئے تھے۔ آخر کار ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلی نے اس سیلابِ بلا کے زد کو توڑ دیا۔ انتشار، بے چینی !!۔
۱۹۴۸ء کے بعد نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نئی قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ اردو زبان کا

اب وہ موقف نہیں رہا تھا جو نظام کے زمانہ میں تھا۔ اس کی جگہ انگریزی نے لے لی تھی۔ ۱۹۵۶ء کی تنظیم جدید کے بعد تو ریاست حیدر آباد کا نقشہ ہی بدل گیا۔ تلنگانہ اور آندھرا کے علاقے مل کر آندھرا پردیش کی صورت میں نقشہ پر ابھرے، اور مرہٹواڑہ کے ضلع اورنگ آباد، عثمان آباد، ناندیڑ، بیڑ، اور پربھنی مہاراشٹرا سے اور اضلاع کرناٹک گلبرگہ، بیدر اور رائچور، ریاست کرناٹک سے جا ملے۔ اس تنظیم جدید کا لازمی اثر حیدر آباد کی تہذیبی، سیاسی، معاشی، اور لسانی و ادبی زندگی پر پڑا۔ جامعہ عثمانیہ کے وہ نوجوان جو "مجلس" سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھے ترک مقام کر گئے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد ہی پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ ان نوجوانوں میں اکثر کا تعلق حیدر آباد کی صحافت سے تھا۔ اس وجہ سے ایک خلا کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ایسے نازک دور میں اردو کے چند مخلص خدمت گذار اٹھے اور اردو زبان و ادب کی زندگی کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوششوں کا ذکر میرے لئے قدرے مشکل ہے یہاں میں حبیب الرحمٰن صاحب کی انجمن ترقی اردو ہند اور ڈاکٹر زور کے ادارہ ادبیات اردو کا ذکر کروں گا۔ انجمن سے حبیب الرحمٰن صاحب کے علاوہ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ و صدر انجمن، بیرسٹر اکبر علی خاں، عابد علی خاں، ہارون خان شیروانی، سجاد مرزا، حسینی شاہد، راج بہادر گوڑ، سری نواس لاہوٹی وغیرہ وابستہ ہیں۔

انجمن کے علاوہ اردو ہال ٹرسٹ، اردو مجلس، اردو آرٹس کالج، اور اردو کالج ایسے ادارے ہیں جو پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کی ذات اور شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں اردو ہال اردو والوں کا نقطۂ مرکز بن گیا ہے جہاں اردو مجلس کے ماہانہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اس مجلس کی جانب سے "مجلس" کی اجرائی بھی عمل میں آئی تھی جس کے ایڈیٹر منظور احمد صاحب تھے۔ "مجلس" کے عبدالحق نمبر اور "مومن نمبر" ادبی اہمیت کے حامل شمارے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب کی نگرانی میں ترقی اردو بھی ہفتہ وار رسالہ جاری ہوا تھا۔ یہ دونوں رسالے وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت جلد بند ہو گئے۔

اردو زبان اور ادب کی ترقی کے سلسلہ میں محترم حبیب الرحمن صاحب کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ ہم تاریخِ ادب میں ان کی ان گراں مایہ خدمات کو فراموش نہیں کرسکتے میر حسن، اور منظور احمد کے بعد اب صلاح الدین نیرؔ اردو مجلس کے معتمد ہیں۔ نیرؔ اچھے شاعر ہی نہیں اچھے منتظم بھی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو مجلس کے ماہانہ اجلاس حیدر آباد کے ادبی ماحول کا نمائندہ بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے ذریعہ ادب کی خدمت کے کام کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ایوان اردو کی تعمیر ان کا نمایاں کارنامہ ہے۔ ادارہ کا کتب خانہ اپنے ذخیرہ کے اعتبار سے ہندوستان بھر کا ایک اہم کتب خانہ ہے اور ریسرچ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ "سب رس" ۱۹۳۸ء سے آج تک مسلسل اور پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ زورؔ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے سنجیدہ اور قابل احباب اس کام کو لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ مولوی سید علی اکبر، مہندر راج سکسینہ، عابد علی خاں، ہاشم علی اختر، غلام جیلانی، رمن راج سکسینہ، اکبر الدین صدیقی۔ وقار خلیل، میر سراج علی خاں، عارف الدین حسن اور جمال الدین کی خدمات کو ہم بھول نہیں سکتے۔ اردو زبان و ادب کے لئے ان ساز گار حالات میں رسالہ "سب رس" کی اجراء بجائے خود بھی بڑا کارنامہ ہے۔ ان اداروں کی کارکردگی نے اردو کے لئے ایک نیا ماحول پیدا کر دیا اور مایوسی کی فضا بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ اور اب اردو صحافیوں کا نیا کارواں نئے معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں رواں دواں ہے۔

رسالہ طبابت

رسالہ طبابت حیدرآباد میں اردو صحافت کا نقطۂ آغاز ہے۔ میڈیکل اسکول حیدرآباد کے مہتمم جارج اسمتھ نے اس مفید طبی رسالہ کو ۱۲۷۵ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء میں جاری کیا[1] اس طرح تاریخِ اردو صحافت حیدرآباد اپنی ایک صدی مکمل کر چکی ہے۔ اس ایک صدی میں علم طب کے علاوہ دیگر علوم و فنون سے متعلق بھی کئی رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ گو آج حیدرآباد سے کوئی معیاری اور مفید طبی رسالہ شائع نہیں ہو رہا ہے جبکہ دیگر علوم و فنون خصوصاً شعر و ادب سے متعلق، بعض اہم اور معیاری رسالے اور اخبارات جاری ہیں اس کے باوجود رسالہ طبابت اپنی اوّلیت کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغلیہ دور اور بعد میں آصف جاہی دور میں بھی یونانی طریقۂ علاج کو شہرتِ عام حاصل تھی۔ اور انیسویں صدی کے خاتمہ تک بھی دکن میں لوگ "انگریزی دوا" کے نام سے واقف نہیں تھے۔ البتہ رزیڈنٹ اپنے علاج کے لیے اپنا ایک سرجن رکھتا تھا جو ایلوپیتھک طریقہ سے علاج کرتا تھا۔ رزیڈنسی کے باہر شاید ہی کوئی اس طریقۂ علاج سے واقف تھا حتیٰ کہ بادشاہ وقت بھی اور امرائے انگریزی دوا سے نابلد تھے۔ لیکن نواب ناصر الدولہ نظام چہارم کی وجہ سے حیدرآباد میں انگریزی دوا

---

[1] بھرمزجی روزنامہ سیاست مورخہ ۲۰ جنوری ۷۵ء کے ٹاپ کے کالم "یہی حیدرآباد کے قدیم اخبارات" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ "اس رسالہ کی ابتدا ۱۸۵۸ء میں نہیں ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی"

کا چلن ہوا اور آج یہ سب سے زیادہ مفید اور مقبولِ عام طریقۂ علاج سمجھا جاتا ہے۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نواب ناصر الدولہ بہادر کا مزاج ۱۸۴۰ء میں مرض "حرقت بول" سے ناساز ہو گیا۔ درباری حکماء اور حیدرآباد کے نامی گرامی اطباء نے علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جنرل اسٹیورٹ فریزر رزیڈنٹ حیدرآباد نے کے پاس حاضر ہوئے۔ اور ان ہی کی سفارش پر انگریز ڈاکٹر ولیم کیمبل میکلین کو علاج کرنے کی اجازت دی گئی۔ انگریزی دواؤں سے نواب ناصر الدولہ صحت یاب ہو گئے۔ اور خوش ہو کر ارشاد فرمایا کہ اگر ملکِ سرکارِ عالی میں انگریزی دوا رائج ہو جائے تو یہاں کی رعایا کو بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ نواب سراج الملک دیوانِ وقت نے اس طریقۂ علاج کی ہر چند مخالفت کی لیکن یہ تو سلطانِ وقت کا فرمان تھا کہاں ٹلتا۔ چنانچہ ایک میڈیکل اسکول کھولنے کی اجازت صادر فرمائی گئی۔ ڈاکٹر میکلن نے توپ کے سانچہ کے قریب "ادگل بے صاحب" کا مکان تیس روپیہ کرایہ پر لیا لیکن ڈاکٹر میکلن اور میر امام علی خان مصاحب حضور نظام کی کوششوں کے باوجود کسی بھی منصب دار نے اس اسکول میں داخلہ نہیں لیا۔ اور ساری کوششیں رائیگاں نظر آنے لگیں۔ اس زمانہ میں شمس الامراء اپنی تعلیمی تحریکات کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں منصب داروں اور جاگیرداروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ فخریہ تھا۔ انہوں نے میڈیکل اسکول کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر اسی اسکول کے کوئی بیس نوجوانوں کو طبی تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ نواب شمس الامراء کی خصوصی دلچسپی کے نتیجہ میں ۲ رمضان المبارک ۱۲۶۲ھ روز دوشنبہ کو میڈیکل اسکول حیدرآباد میں تعلیم کا آغاز ہوا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے بہت پہلے مطابق ۱۸۴۹ء میں اردو زبان ذریعہ تعلیم بن چکی تھی چنانچہ ڈاکٹر میکلن جب بحیثیت مہتمم (پرنسپل) مامور ہوئے تو انہوں نے اردو میں تعلیم دینی شروع کی ان کی مدد کے لیے ایک مترجم بھی تھا۔ ڈاکٹر میکلن کے بعد ۱۸۵۵ء میں ڈاکٹر جارج

اسمتھ رزیڈنسی سرجن ہوئے تو طریقہ کے مطابق میڈیکل اسکول کے مہتمم بھی بنائے گئے
ان ہی کے زمانہ میں طلبا اور عوام کے فائدے کے خاطر ایک رسالہ بھی "طبابت" کے نام
سے ۱۸۵۷ء میں جاری کیا گیا۔ اس طرح تاریخ صحافت میں ڈاکٹر جارج اسمتھ کو ان کے
اس کارنامے کی وجہ سے ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔ جارج اسمتھ زیادہ دنوں تک اپنے
منصب پر فائز نہیں رہے اور ۱۸۶۱ء میں جارج فلمنگ نے ہتممی کا جائزہ حاصل کیا۔
ان کے دور میں رسالہ طبابت جاری رہا۔ اس طبی رسالہ میں مریضوں پر عمل جراحی کرنے اور
ان کے بارے میں تفصیلات ہوتی تھیں گو طبی نقطۂ نظر سے ان معلومات کی آج کوئی
اہمیت نہیں ہے لیکن زبان کے لحاظ سے اس تدریجی ارتقاء کا اندازہ لگایا جاسکتا جو پچھلے
برسوں میں ظاہر ہوا ہے۔ غالباً فلمنگ خود بھی اچھی خاصی اردو لکھ پڑھ لیتے تھے۔ یہاں ان
ہی کی تحریر درج ہے جو رسالہ طبابت سے نقل کی گئی ہے۔

"ایک عورت قدم سے اہل اسلام کے کہ عمر اس کی قریب پچیس سال
کی ساکن قصبۂ بیٹر کی نام اس کا پاپابی شہر شوال المکرم ۱۲۷۷ھ کو نزدیک اس
فدوی کے آئی اور ایسا بیان کی کہ یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے اور دن بدن
ترقی پر ہے۔ القصہ اس فدوی نے اول اس بیمارہ کو بے ہوش کر کے یوموں آٹری
تر ینکنٹ سے باندھ کر ایک اسکپاسل سے بیضاوی شکل کی مانند چیر کر
پوست کو تشریح کر اس رسولی کو امانت نکال لیا اور وہ بھی مادہ اس رسولی
کا رہنے نہ دیا بعد از آٹری وغیرہ کو لب زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اڑی زف
پلاسٹر کے تسمے لگا دیا اور انٹی نلو جنٹک رجمنٹ کے حال پر رکھا۔ چند روز
میں عنایت الٰہی سے وہ بیمارہ درست ہو گئی اور وہ رسولی دو اونس چار
درام تھی۔" (فلمنگ)

جب نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ کا دور حکومت آیا اور بہت سی تعلیمی اصلاحیں
ہوئیں تو اس میڈیکل کالج کو عصری تقاضوں کے مطابق بنایا گیا اور اس اسکول کا نام عثمانیہ

میڈیکل کالج رکھا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا جب قیام عمل میں آیا تو ۱۹۳۶ء یا ۱۹۲۷ء میں اس کالج کو عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحق کیا گیا۔ گو ۱۸۴۹ء میں اسکول کے قیام کے ساتھ ہی اس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا لیکن زبان کی دشواریوں کے پیشِ نظر ۱۸۸۴ء میں میڈیکل اسکول کی تعلیم کا ذریعہ بجائے اُردو کے انگریزی ہو گیا تھا لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد بھی ذریعہ تعلیم میں تبدیلی آئی اور جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان ہی قرار پائی۔ ۱۹۴۸ء میں سیاسی انقلاب آیا اور سلطنتِ آصفیہ کا چراغ بجھ گیا۔ حیدرآباد انڈین یونین میں ضم ہو گئی۔ دیگر بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نواب علی یاور جنگ کے زمانہ چانسلری میں جامعہ کا ذریعہ تعلیم پھر ایکبار اُردو سے انگریزی میں بدل گیا۔

ہرمزجی نے رسالہ طبابت کے تعلق سے لکھا ہے کہ "ماہ جمادی الاول ۱۳۱۶ھ م سپٹمبر / اکٹوبر ۱۸۹۸ء میں اس رسالے کا نام "دکن میڈیکل جرنل" رکھا گیا اور اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالہ کی پہلی جلد میں قدیم حیدرآباد کے مشہور و ممتاز ڈاکٹروں کے مضامین، جن میں قابلِ ذکر ڈاکٹر لاری، ڈاکٹر ایم جی نائیڈو، ڈاکٹر احمد مرزا اور ڈاکٹر شاہ میر خان ہیں۔"

جامعہ میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے بعد اُردو رسالہ کی اشاعت ختم ہو گئی۔ رسالہ طبابت اپنے ابتدائی دور میں نواب سالار جنگ کے چھاپہ خانہ سے طبع ہو کر میڈیکل اسکول سے جاری ہوا کرتا تھا۔

ماہنامہ مخزن الفوائد

مولوی منظر علی اشہری نے اپنی کتاب منظر الکرام میں لکھا ہے۔ "آپ (مولوی سید حسین بلگرامی) حیدرآباد تشریف لائے تو مخزن الفوائد کے نام سے اپنی مادری زبان میں ایک مفیدِ عام رسالہ جاری فرمایا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب حیدرآباد سے کوئی رسالہ شائع

نہ کیا جاتا تھا۔ صاحب منظر الکرام کے مطابق مولوی سید حسین بلگرامی سنہ ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ انہوں نے آپ کی آمد کی وجہ یہ بتائی ہے کہ سنہ ۱۸۷۲ء میں سرسالار جنگ اعظم بتقریب سیر و سیاحت لکھنو تشریف لے گئے تو جنرل بیرو نے ان کی خدمت میں مولوی سید حسین کی تقریب کی اور اس مردم شناس مدبر اعظم کے اصرار پر معتمدِ خاص کی حیثیت سے جون سنہ ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے۔" اس سلسلہ میں آغا مرزا نواب سرور جنگ کے بیان اور صاحب منظر الکرام کے بیانات میں جزا تضاد موجود ہے۔ "کارنامہ سروری" میں سرور الملک نے لکھا ہے۔ "اثنائے امیدواری میں ایک خط سید حسین بلگرامی کا میرے نام آیا کہ ضاقت علی ارض" جس طرح ہو سکے مجھ کو حیدرآباد بلوالو۔" چنانچہ سرسالار جنگ سے ملنے کے بعد انہیں بلا لیا گیا۔" مولوی سید حسین بلگرامی حیدرآباد کس طرح پہنچ گئے یہ تحقیق بڑی دلچسپ رہے گی کیوں کہ نواب سرور جنگ نے ان کی آمد کے بعد کے بھی بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ ان واقعات کی صداقت کتنی ہے اور چوں کہ یہ بھی سید حسین بلگرامی، مہدی علی خان، مہدی حسن اور مشتاق حسین کے ہم عصر ہیں اس لیے ان حضرات کو "اہلکاران ریاست" کے نام سے مخاطب کرنے میں کتنی ذاتی پرخاش شامل ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ البتہ مولوی سید حسین بلگرامی کی آمد کی تاریخ کے سلسلہ میں مولوی حسن الدین احمد (آئی اے ایس) نے اپنے مضمون (خاتون دکن نومبر ۱۹۷۱ء) میں سنہ ۱۸۷۳ء ہی بتایا ہے اور اس طرح مولوی سید حسین بلگرامی کی حیدرآباد میں آمد ۱۸۷۳ء ہی قرار پاتی ہے۔ مولوی حسن الدین احمد صاحب ہی کے بیان کے مطابق حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال رسالہ مخزن الفوائد جاری کیا گیا۔ اس بیان کے مطابق رسالہ مخزن الفوائد کی تاریخ اجراء سنہ ۱۸۷۴ء قرار دی جاتی ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حیدرآباد میں رسائل کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صاحب منظر الکرام کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ جب مخزن الفوائد جاری ہوا تھا تو اس وقت کوئی رسالہ شائع نہ کیا جاتا تھا۔ اس سے قبل ہی   جاری اسمتھ نے طبیہ کالج سے رسالہ طبی جاری کیا تھا۔ سنہ ۱۸۷ء میں میتھ کرتان کے نام سے حاجی کرتان کا ہفتہ وار اور سنہ ۱۸۶۶ء میں مہدی علی نے

مراۃ القوانین کے نام سے ایک قانونی ماہ نامہ جاری کیا تھا البتہ یہ صحیح ہے کہ متین کرتان ہفتہ وار اخبار کہلاتا تھا اور رسالہ طبی اور مراۃ قوانین دو ایسے رسالے تھے جن کا تعلق طبابت اور قانون سے تھا۔ چوں کہ "مخزن الفوائد" ادبی اور معلوماتی رسالہ تھا اس لیے ان معنوں میں یہ پہلا رسالہ ہے اور مخزن الفوائد کی اجرائی سے حیدرآباد کے رسائل کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

مولوی سید حسین بلگرامی ذہین اور فرلیس انسان تھے۔ جب سنہ ۱۸۸۴ء میں حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان تخت نشین ہوئے تو مولوی سید حسین کو یار خان بہادر اور موتمن جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں اور ۱۸۹۰ء میں عماد الدولہ اور عماد الملک کے خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ آخری زمانے میں سالار جنگ ثالث کے قلمدان وزارت کو حاصل کرنے کے بعد عماد الملک کو مشیر خاص کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔

مولوی سید حسین بلگرامی علی گڈھ کالج، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قدیم ٹرسٹی رکن تھے دار المصنفین اعظم گڈھ اور انجمن ترقی اُردو کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ خود حیدرآباد میں محکمہ تعلیمات کی باگ ان کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے چار بڑے مدرسے مدرسہ عالیہ، مدرسہ دار العلوم، سٹی انگلش اسکول اور چادر گھاٹ ورناکلر اسکول قائم کیے۔ اس کے علاوہ مدرسہ اعزہ، زنانہ مدرسہ، مطبع دائرۃ المعارف، کتب خانہ آصفیہ، مدرسہ تعلیم اعلمین، انجینئرنگ اسکول مدرسہ صنعت و حرفت اورنگ آباد اور نظام کلب محض آپ کی تحریک پر قائم ہوئے۔ مولوی حسن الدین احمد نے اپنے مضمون (رسالہ خاتون دکن مورخہ نومبر ۱۹۷۱ء میں لکھا ہے کہ دائرۃ المعارف کا قیام ملا عبد القیوم کے تعاون کے ساتھ سنہ ۱۸۸۸ء میں عمل میں آیا۔ کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور سید علی حیدر طباطبائی اس کے پہلے مہتمم مقرر کیے گئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا اور سنہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اُردو کے صدر منتخب ہوئے۔ مولوی حسن الدین احمد صاحب ہی کے بیان کے مطابق حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال رسالہ مخزن الفوائد جاری کیا۔ انھوں نے بھی حسین بلگرامی کی حیدرآباد میں آمد کی تاریخ سنہ ۱۸۷۳ء

لکھا ہے لیکن آمد کس طرح ہوئی کوئی واقعہ تحریر نہیں کیا ہے۔ بہرحال سید حسین بلگرامی صاحب کے اعلیٰ علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے پیش نظر حیدرآباد میں انکی بہت عزت ہوئی اور انھوں نے اونچا مقام بنالیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے آپ کی خدمات کے صلہ (ایل ایل ڈی) کی ڈگری ۱۹۲۵ء میں پیش کیں اور جامعہ عثمانیہ سے بھی ۱۹۲۶ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

مولوی سید حسین بلگرامی کے کارناموں میں رسائل عماد الملک (اردو) حیات سالار جنگ اول (انگریزی) تاریخ مملکت آصفیہ اور قرآن پاک کا ناتمام ترجمہ کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ رسالہ مخزن الفوائد کی اجرائی بھی ان کا صحافتی کارنامہ ہے۔ غالباً یہ رسالہ ۱۸۸۴ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک برابر شائع ہوتا رہا ہوگا۔ اس سلسلہ میں تحقیق مزید کی ضرورت ہے۔

ماہنامہ ادیبؔ

مدیر۔ سید احمد حسین امجد۔ مشیر دکن میر حسن

ظفریاب خان حیدرآباد

۱۸۸۲ء میں انجمن اخوان الصفا حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوا اور پھر مئی ۱۹۰۸ء کو اس کا پہلا شمارہ سید احمد حسین امجد کے زیرِ ادارت شائع ہوا۔ اس کے مہتمم ظفریاب خان تھے جو دوسرے سال اس کے مدیر بن گئے۔

امجد دکن کے باکمال شاعر اور رباعیات کے شہنشاہ کہلاتے ہیں۔ آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد صوفی رحیم علی تھے جن کا انتقال آپ کی کم سنی کے زمانہ میں ہوگیا والدہ نے آپ کی پرورش کی تھی۔ مدرسۂ نظامیہ اور مدرسۂ دار العلوم میں آپ کی تعلیم ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی اس کے بعد علامہ سید وقار الدین سے فلسفہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ طغیانی رود موسیٰ ۱۹۰۸ء کا حادثہ کئی اعتبار سے امجدؔ کی زندگی میں تباہیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا چنانچہ پورا خاندان جو والدہ

بیوی اور لڑکی پر مشتمل تھا دریا برد ہو گیا۔ اس کنبہ کے ساتھ ان کا شعری سرمایہ بھی غرقِ آب ہوا اور "ادیب" کا زیرِ طبع رسالہ بھی، چنانچہ "ادیب" کا "طوفان نمبر" اس المناک حادثہ کی یادگار ہے۔ جس میں واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور گھانسی بازار کی تباہی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے یہ بھی "ادیب" میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ارکینِ انتظامی کے تاریخی فوٹو ہیں، محمد عزیز مرزا، ذوالقدر جنگ مسٹر ہمایوں مرزا، عزیز جنگ بہادر وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس حادثہ کو جن شاعروں نے منظوم کیا ہے ان میں محب حسین محب نثار احمد سیف الدین شباب، ظفر حسین عبرت، صبر دہلوی، علی حیدر طباطبائی، ماہر گنتوری کے علاوہ خود حضرت امجد بھی شامل ہیں۔

ادیب حیدر آباد کے ابتدائی رسائل میں کافی اہم رسالہ ہے اس کو اپنے وقت کے تمام لکھنے والے ادیبوں کا تعاون حاصل تھا مثلاً حبیب احمد نمائی، شمس اللہ قادری، خورشید علی، محب حسین علی حیدر طباطبائی، ماہر گنتوری کے علاوہ ظفریاب خان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ سوانحی، تاریخی اور ادبی مضامین اس میں شامل کیے جاتے تھے چنانچہ شمس اللہ قادری کا تاریخِ دکن سے متعلق مضمون "آثار الکرام" جلد (۱) کے بیشتر شماروں میں بلا اقساط شائع ہوا ہے۔

اس رسالہ کی اجرائی کا مقصد حیدر آباد سے نکلنے والے ایک دو اخباروں اور ایک دو رسائل میں ایک بہتر ماہ نامہ کا اضافہ تھا حضرت امجد ملازمت کے سبب ادارت سے منتقل ہو گئے اور اس کے بعد یہ ظفریاب خان کی ادارت میں کئی سال تک نکلتا رہا۔ یہ کیوں، اور کب بند ہوا اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے ابتدائی تین شمارے مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

جس زمانہ میں حیدر آباد سے ادیب شائع ہوتا تھا اس زمانہ میں الہ آباد سے بھی "ادیب" اسی نام کے نکلتے تھے چنانچہ ان دونوں رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ "ادیب" کے نام سے سید احمد علی شہری نے علی گڈھ سے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا۔ یہ شمارہ بھی اکبر صاحب کے یہاں موجود ہے

ماہنامہ "حسن"

حیدرآباد کے ادبی رسائل میں "ماہ نامہ حسن" منفرد مقام رکھتا ہے۔ مضامین پر انعام دینے کا طریقہ شمال سے لے کر جنوب کے تمام پرچوں میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ ماہ نامہ "حسن" حیدرآباد کے ابتدائی چند ماہناموں میں سے ہے لیکن معیار کے اعتبار سے بعد کے بھی رسائل میں کافی اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اس رسالہ کے بارے میں رائے دی ہے کہ یہ حیدرآباد کا مشہور اور نامور رسالہ ہے جس کو اردو کے معیاری رسالوں میں شمار کرنا چاہیے۔ اس رسالہ کے پہلے شمالی ہند بھی کوئی رسالہ سوائے تہذیب الاخلاق کے اس خوبی اور اس معیار کا جاری نہیں ہوا۔ یہ باوقار علمی ادبی ماہوار رسالہ مغربی ماہنامہ پرچوں کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔[۱] نواب عماد نواز جنگ خود ذی علم آدمی تھے اور ان کا ادبی مرتبہ بھی بلند ہے بیشتر مضامین بلکہ بعض اوقات پورا رسالہ ان ہی کے نوکِ قلم اور فکر و خیال کا رہینِ منت ہے۔ تذکرۃ المشاہیر تاریخ گلبرگہ، فرانس کا انقلاب عظیم سوانح عمری امیر کبیر نواب شمس الامرا حالات عمارات بیجاپور، قیصر بانی سلطنت روما ئتہ الکبریٰ اور ہندوستان اور قیصری حکومت جیسے طویل مضامین جنھیں علیحدہ کتابی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے ان ہی کی کاوشوں اور کوششوں کا حاصل ہے۔ مدیرانِ حیدرآباد میں مسلسل کاوشوں کی مثال عماد نواز جنگ کے بعد کہیں مل سکتی ہے تو وہ نیاز فتحپوری کے "نگار" کے خاص نمبر اور دوسرے پرچے ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ عماد نواز جنگ اپنی قلمی کاوشوں

۱۔ ... دکن میں ... (... اشاعت) ص ۳۳۴

"حسن" میں پیش کرنے پر اکتفا کیا بلکہ "حسن" کے حسن کو دوبالا کرنے اور معیار کو اونچا بنانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے تعاون عملی حاصل کیا جن میں عماد الدولہ بہادر (سکریٹری کونسل آف اسٹیٹ و ناظم تعلیمات سرکار عالی) جمشید جی محمد ذکاء اللہ شبلی نعمانی غلام الثقلین، نواب فتح نواز جنگ مشیر الملک خیر الدین خان محمد جنگ، راجہ کشن پرشاد، حبیب الرحمن شیروانی مجیب احمد تمنائی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس رسالہ کے معیار کو بلند کرنے میں جہاں عماد نواز جنگ کی قلمی کاوش اور دیگر ادیبوں کی تحریروں کو اہمیت حاصل ہے وہیں اچھے اور معیاری مضمون پر ایک اشرفی کی ترغیب بھی اہم وجہ رہی ہے۔ انعام یافتگان میں نئے اور پرانے سبھی مضمون نگار شامل رہے ہیں۔ یہ انعام ہر معیاری مضمون پر دیا جاتا تھا۔ اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ ہر ماہ جو مضمون معیار پر اترتا اسے انعام دیا جاتا مگر بیشتر مہینے یوں بھی گذر جاتے لیکن کسی مضمون کو معیاری نہیں قرار دیا جاتا۔ انعام پانے والے مضامین میں ادبی کم تاریخی اور علمی و مذہبی مضامین زیادہ شامل ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں کو ایک اشرفی انعام ملی ہے ان میں قابلِ ذکر جمشید جی مولوی عبدالکریم مولوی محمد ابوالحسن مولوی غلام الثقلین محمد یوسف علی قزلباش ایڈیٹر آئینہ اقبال علی بہادر، طفیل احمد، اصغر حسین حبیب الرحمن شیروانی، شیدا علی لکھنو احمد شفیع نائب عذیر ریاست بہاولپور سراج احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ مجیب احمد تمنائی سید جلال ذکاء اللہ اور شبلی نعمانی جیسے بلند پایہ ادیب شامل ہیں۔

ماہ نامہ "حسن" کا پہلا شمارہ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا اور مسلسل نو جلدیں تکمیل ہوئیں۔ نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس رسالے کے نمبر موجود ہونے کا پتہ دیا ہے ۱ لیکن انھیں ترتیب وار مجلد نہیں کیا گیا البتہ ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی کی ذاتی دلچسپی اور محنت سے رسالہ

ص ۱ ۔ دکن میں اردو حاشیہ ص ۳۴۴۷

حسن" کی اکثر ترتیب وار رسائل کی جلدیں جمع کردی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ آزاد اور ینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ (باغ عامہ) میں بھی اس کی تقریباً پوری جلدیں موجود ہیں ۔ ادارہ ادبیات اردو نے دکھنیات اور حیدرآبادی ادب پر جو احسانات کئے ہیں ان میں سے حیدرآباد کے ادبی نیم ادبی اور مذہبی و سائینسی رسائل وجرائد کا قابل لحاظ ذخیرہ محفوظ کرنا بھی اہم کارنامہ ہے۔

ماہ نامہ "حسن" کے پہلے شمارہ پر کوئی اداراتی نوٹ نہیں ہے البتہ آخری ہی صفحہ کے اندرونی حصہ میں اعلان لکھا ہے جس میں چند امور کا ذکر پایا جاتا ہے مثلاً رسالہ کی قیمت (۱۲) (۲) ایک اشرفی اس مضمون یا ترجمہ کے عوض نذر کی جائیگی جو سب سے اعلیٰ ہو ۔ ۳ ۔ ناپسند مضمون طبع ہوگا اور نہ واپس ہوگا ۔ آخر میں شرح دستخط حسن بن عبداللہ المخاطب نواب عماد نواز جنگ بہادر لکھا ہے ۔ اکثر مضامین کے شروع میں ادارہ کی جانب سے تمہید لکھی جاتی تھی جس میں مضمون اور مضمون نگار کا مختصر الفاظ میں تعارف ہوا کرتا تھا ۔ بلاشبہ گیٹ اپ کتابت اور چھپوائی اور ترتیب مضامین کے اعتبار سے ابھی تک کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا اسی وجہ سے مذہبی، سائینسی، تاریخی اور ادبی مضامین ایک ساتھ شامل ہوا کرتے تھے ۔ لیکن معنوی اعتبار سے ادبی مضامین کا معیار اور زبان و بیان کے لحاظ سے شستگی اور شائستگی حیدرآباد سے نکلنے والے سبھی پرچوں کی مسلمہ رہی ہے ۔ شمالی ہند اور دکن کی زبانوں کا کوئی فرق ان رسائل میں نظر نہیں آتا البتہ حیدرآباد پہلا رسالہ طباعت حیدرآبادی زبان اور انداز میں نظر آتا ہے ۔ لیکن اس کے بعد کے رسالوں یعنی معلم شفیق ادیب فنون اور حسن میں زبان صاف ستھری اور معیاری بن گئی ہے اور اندازِ بیان بھی دلکش ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان رسائل سے ملک بھر کے تمام ادیبوں اور شاعروں کا تعاون عمل اور مدیرانِ رسائل کی ذاتی دلچسپی بھی ہے ۔

بلاشبہ نواب عماد نواز جنگ اچھے انشاء پرداز ضرور تھے لیکن علم و ادب ان کا حقیقی میدان نہیں تھا وہ تو ملک کے انتظامیہ سے وابستہ تھے ۔ لیکن اپنی علم دوستی اور ادبی لگاؤ کی وجہ سے انہوں نے اس معیاری رسالہ کی اجرائی کا بیڑہ اٹھایا اور وہ بھی اس طرح کہ "حسن"

ادبی اور علمی جرائد میں منفرد اور بے مثال کہلایا۔ "حسن بن عبد اللہ نواب عماد نواز جنگ[1]
سلطنت حیدر آباد کے ناظم کروڑ گیری تھے۔ وہ قریشی اور اولاد جعفر طیار سے نسبت رکھتے
تھے۔ نواب صاحب کی سرکاری خدمت ۱۸۶۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ وہ پہلے نلدرگ ضلع رائچور
کے پولیس انسپکٹر مقرر ہوئے پھر سالار جنگ نے انہیں محبوب نگر کا کلکٹر مقرر کیا۔ بعد ازاں
پولیس ڈیپارٹمنٹ میں وزیر صیغہ پولیس کے سکریٹری کے طور پر مقرر کیا اس کے بعد ان کی تبدیلی
محکمہ مال ضلع بیڑ میں کلکٹری پر ہوئی۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں صدر محاسب ہوئے اور ان کی تنخواہ
ایک ہزار سے انیس سو کر دی گئی۔ یعنی خدمات کے علاوہ وہ شہر عامہ کے باغات پر نگرانی بھی رکھتے
تھے۔ ان کو بارہ سو سواروں پر سرداری بھی دی گئی یہ عہدہ جمعدار نظم جمیعت کہلاتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۷ء
میں سٹلمنٹ اور سروے کمشنر بنائے گئے اور اس سال آبکاری اور افیون کے کمشنر اور انسپکٹر جنرل
ہوئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے دنیا کا سفر بھی کیا اور جزیرہ ملایا۔ چین جاپان امریکہ اور
یورپ گئے۔ جس کے بعد وہ حج بیت اللہ بھی گئے۔[1] اس طویل سفر سے واپسی پر انہوں نے
اگسٹ سنہ ۱۸۸۸ء میں ماہ نامہ "حسن" کو شائع کر دیا جو مسلسل نو سال تک شائع ہوتا رہا
یورپ میں اشاعت اسلام تیموریہ خاندان کے علوم و فنون وسط یورپ فرانس کا انقلاب عظیم
سلطنت رومۃ الکبریٰ کے حالات کی سیر ت اور سلطنت روس وغیرہ میں ان کے اس سفر
کی جھلکیاں اور مشاہدات کی پرچھائیاں ملتے ہیں۔

ماہ نامہ "حسن" حیدر آباد کے رسائل میں اولین اہمیت رکھتا ہے لیکن جہاں تک
اول مضامین اور زبان و ادب کے مسائل و مباحث کا تعلق ہے اس میں ایسے بہت کم
مضامین ملتے ہیں۔ زیادہ تر مضامین اخلاقی مذہبی سماجی اور تاریخی ہوا کرتے تھے۔ یہ کوتاہی
وسط صدی تک کے رسائل میں نظر آتی ہے۔ تا آنکہ دلگداز (عبد الحلیم شرر) اور دبدبۂ آصفی
(رتن ناتھ سرشار) جیسے ادبی رسائل کی اجرائی عمل میں نہیں آتی۔ سنہ ۱۸۵۹ء (رسالہ طباعت) سے

---

[1] حیدر آباد

افسر (محب حسین) یا پھر دلگداز اور دبدبہ آصفی کے زمانہ (سنہ ۱۸۹۷ء) تک ادبی اور معیاری مضامین کی کمی رہی ہے لیکن درحقیقت یہ حیدرآباد کے رسائل کا عبوری دور تھا اور خود عوام میں ادب کا شعور عام نہیں تھا یا پھر کم از کم ادب کا جو موجودہ تصور رہا ہے اس کی عدم موجودگی بھی اس کی اہم وجہ رہی ہے۔ لیکن زبان و بیان کا جہاں تک معاملہ ہے ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ ان رسائل کا معیار بے حد بلند رہا۔ زبان شستہ اور بیان شائستہ ہوا کرتا تھا یہ رسالہ سنہ ۱۸۹۰ء تک شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔

معلم نسواں

حیدرآباد میں اردو ادب کے ادبی رسائل کی تاریخ ایک صدی پرانی ہے یا پھر اس کا جنم ابھی ابھی برسوں ہی پچھلی صدی کو ہوا۔ لیکن اس کم مدت میں ادبی رسائل کا جو رول رہا ہے وہ تاریخِ ادبِ اردو میں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے یہ رسائل بہت جلد ہند گیر شہرت کے مالک ہو گئے اور ان کے لکھنے والوں میں بیک وقت حیدرآباد لکھنؤ کے ادبا اور شعرا شامل تھے اس کے علاوہ علی گڈھ، پٹنہ اور دہلی کے لکھنے والوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ حیدرآباد کے ان ادبی رسائل کے معیار کو بلند کرنے میں یقیناً ان رسائل کے ایڈیٹروں کا ہی ہاتھ رہا ہے جن لوگوں نے حیدرآباد میں اردو صحافت کو پچھلے برسوں نیا رنگ روپ دیا۔ اور نئی تبدیلیاں لائے ہیں ان میں محب حسین کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ جدید صحافت کے اس "معمارِ اولین" نے صرف رسائل کے معیار ہی کو نہیں بلند کیا ظاہری اعتبار سے بلکہ معنوی لحاظ سے بھی فکر و عمل کے چراغ روشن کیے۔

محب حسین نے اپنی زندگی کے مقصد کا تعین کیا تھا اور وہ مقصد اصلاحِ معاشرہ تھا۔ مسلم معاشرہ کی تن آسانی انہیں بھی خون کے آنسو رلاتی تھی۔ وہ دردِ مسلم ان کے سینہ میں ہوک سا تھی

صورت اختیار رہا ہے جس کی کسک، راتوں کی نیند اچٹ لے جاتی ہے اور دن کا آرام جس سے حرام ہوتا ہے۔ محب حسین بلا شبہ صحافی بھی تھے اور ادیب بھی ان کی شاعری اور ان کے خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے ہر میدان سے معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی۔ محب حسین "بانی حقوق نسواں" کے نام سے بدنام ہیں۔ لیکن ان کی ساری کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بڑی سنجیدگی رکھتی ہے کہ محب حسین نے "حقوق نسواں" کے لیے جو کوشش کی ہے اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں پورے اترنا چاہتے تھے اور وہ مقصد اصلاح معاشرہ ہی تھا۔

محب حسین نے آزادئ نسواں کی تحریک چلائی۔ گو یہ آواز حیدرآبادی تہذیب اور جاگیردارانہ ماحول کے منافی تھی اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "آزادئ نسواں" کے تصور کا جو غلط مفہوم عام ہوا اس سے معاشرہ روبہ اصلاح تو کیا ہوتا اور زیادہ آلودہ ہوتا نظر آیا لیکن اس غلط تصور کی تردید کے ساتھ ساتھ فکر صحیح کو عام کرنا اور عورت کو جہالت کی وادی سے نکال کر علم و خیال کی روشنی سے ہم کنار کرنا بھی ضروری تھا۔ محب حسین نے آزادئ نسواں کی تحریک کو اپنی شاعری اور انشائپردازی کے ذریعہ ہی نہیں رسائل کے ذریعہ سے بھی عام کیا ہے۔ چنانچہ روزنامہ علم و عمل ہو یا معلم شفیق، معلم نسواں ہو یا پھر افسر دیوان محب ہو کہ خطوط محب بھی جگہ آپ ایک ہی آواز اور ایک ہی آہنگ پائیں گے۔ اس سے محب حسین کی اپنے مقصد سے مجنونانہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ محب حسین نے معلم شفیق اور پھر معلم نسواں کے ذریعہ سماج کی پرانی رسموں پر کاری ضرب لگائی ہے نئی قدروں اور نئے رجحانات کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں انہیں مختلف دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ محب حسین مخالفتوں کا مقابلہ کرتے کرتے زمانۂ پیری میں قدم رکھتے ہیں۔ تو اپنے جسمانی جواب دیتے ہیں اور جب مقابلے کی تاب باقی نہیں رہتی تڑپ کر رہ جاتے ہیں لیکن ذہن میں کمی اور مقصد میں تبدیلی نام کو نہیں آتی۔ "معلم نسواں" ان ہی دو وجوہات کی بنا پر بند ہوا۔ چنانچہ اس ماہنامہ کے آخری شمارے میں لکھتے ہیں۔ ع۱

ع۱- معلم نسواں ص ۶۰ جلد نمبر (۱۴) شمارہ (۱۱)

"اس رسالہ کے بند کرنے کے مخفی اسباب کا اظہار ہم اس وقت نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے اوپر یہ مثل صادق آتی ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔"

اور اس دردانگیز آواز کے معدوم ہوتے ہی "معلم نسواں" بھی بند ہو گیا۔ "معلم نسواں" کو دکن میں تحریکِ نسواں کا زبردست بانی اور ترجمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بہت کم رسائل ایسے ہوتے ہیں جو زمانہ کی تقدیر کو بدلنے میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ "معلم نسواں" نے آزادیٔ نسواں کی جو تعلیم دی ہے اس کے مفید نتائج آج ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے "معلم نسواں" کو حیدرآباد کے چند اہم ترین رسائل میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔

"معلم نسواں" ترجمان نسواں ہی نہیں صحیفہ نسواں بھی تھا۔ اس میں جہاں عورتوں کی آزادی، ان کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے متعلق مضامین شامل ہوا کرتے تھے وہیں عالم نسواں کی خبریں بھی دلچسپ انداز میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ "اخبارِ نسواں" کے مستقل کالموں میں ان دلچسپ خبروں پر "معلم" کا تبصرہ بھی ہوا کرتا تھا۔

محب حسین کے دو ناول "سیتا" اور "سوہاگِ روح" "معلم نسواں" ہی کی دین ہیں۔ آزاد خیال کے ڈرامے بھی اس رسالہ کے ذریعہ منظرِ عام پر آئے۔ اور اس کے لکھنے والوں میں محب حسین اور آزاد خیال کے علاوہ عزیز مرزا، مولوی محمد مرتضیٰ، عبد العلیم شرر، مفتی احمد حسین، محسن الملک، صادق حسین اور مولوی عبد الحق کے نام اہم ہیں۔ جہاں تک اس رسالے کی پالیسی کا تعلق ہے اس پرچے میں "علوم قدیمہ و جدیدہ" یعنی ریاضیات، طبقات، الٰہیات، تجارت، اخلاق، طب، تاریخ، جغرافیہ، ادب، کیمیا اور نباتات پر مشتمل ہوا کرتا تھا اور اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ "اخلاق کو مزاح اور تفریح کے ساتھ اور تفریح اور مزاح کو اخلاق کے ساتھ بیان کریں۔ اور ایک کے پیرائے میں دوسری کو دوسری کے پردے میں پہلے کو دکھا کریں گے تاکہ ہماری ناظرین بقول شخصے کہ خرما و ہم ثواب مسائل علمیہ اور اخلاق حسنہ سے مالا مال ہوتے جاویں اور تفریح اور دل بہلائی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی جاوے۔" "معلم نسواں" کی اس کامیاب اجرائی نے بہت جلد رسالے کو مقبول عام بنا دیا۔

اس پرچہ میں غیر مطبوعہ مضامین کے علاوہ منقولہ مضامین اور تراجم بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ محب حسین نے خود کرنل میڈوز ٹیلر کی انگریزی کتاب "سوانح امیر علی ٹھگ" اور "پہلا جرم" ترجمہ کیا۔

"معلم نسواں" میں مختلف کتابوں پر تنقید و تبصرہ بھی ہوا کرتا تھا چنانچہ مولوی عبدالحق نے "صنم خانۂ عشق جو منشی امیر احمد کا دیوان ہے پر "معلم نسواں" میں تبصرہ کیا۔ جدید کتب پر تبصرہ کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

یہ رسالہ مطبع اسلامیہ چھاؤنی رزیڈنسی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی قیمت فی پرچہ ۱۲/ اور سالانہ (٦) تھی۔

ماھنامہ آئینِ دکن ۳

حیدرآباد میں قانونی رسالے کی اجرائی کا سہرا مولوی مہدی علی کے سر باندھا جاتا ہے قانونی جریدہ کی حیثیت سے سب سے پہلے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں ایک ماہ نامہ "مراۃ القوانین" جاری کیا اور وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوئی۔ اب تک وکلاء اور دیگر ضرورت مند حضرات کے لیے ایسا کوئی بھی رسالہ جاری نہ ہوا تھا کہ جس کے مطالعے سے قانونی معلومات میں اضافہ ہوتا، نظائر اور اصولوں سے آگاہی ہوتی اور عدالتوں کے فیصلوں سے واقفیت ہی حاصل ہوتی۔ چنانچہ "مراۃ القوانین" حلقۂ وکلاء میں بھی اور عام طور پر عوام میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ قانونی جرائد کی اجرائی کے اس کامیاب تجربہ کے بعد بہت سے دیگر رسائل بھی جاری ہوئے مثلاً محمد علی کا مقنن دکن ۱۸۸۶ء، آئین دکن ۱۸۹۲ء، عبدالکریم صاحب کا تشریح القوانین ۱۹۰۹ء اور جگن موہن ریڈی کا دکن لا رپورٹ ۱۹۵۴ء کافی مشہور و مقبول ہوئے۔

مولوی فدا حسین مرحوم نے ۱۸۹۲ء میں اورنگ آباد سے اپنا قانونی رسالہ ماہ نامہ "آئین دکن" دوسرا

جاری کیا اور جب وہ ۱۸۹۳ء میں اورنگ آباد سے مشہور شہر حیدر آباد منتقل ہو گئے تو آئین دکن کا دفتر بھی حیدر آباد منتقل ہوا۔ جب وہ اپنی آخری عمر میں مرض دق کا شکار ہوئے تو ۱۹۰۷ء میں حیدر آباد سے اپنے وطن قائم گنج واپس ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ حیدر آباد سے ان کی منتقلی کے بعد ہی ۱۹۰۷ء میں یہ ممتاز قانونی جریدہ بند ہو گیا

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "یادوں کی دنیا" میں مولوی فدا حسین کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مولوی فدا حسین قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد آ گئے۔ اس وقت انکی عمر بیس سال تھی۔ شروع ہی سے انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ طبیعت میں نزاکت اور نفاست تھی۔ گھر سے ہزار بارہ سو روپیہ لیکر نکلے تھے کہ اس سے حیدر آباد میں کچھ کاروبار کریں گے۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں قائم گنج کے بعض لوگ پہلے سے موجود تھے۔ رائے پور کے محمد زماں خاں ناظم فوجداری تھے۔ مولوی فدا حسین نے بیگم بازار میں مراد آبادی برتنوں کا کاروبار شروع کیا۔ وہیں قریب میں شمالی ہند کے ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ مولوی فدا حسین نے وکیل صاحب سے مطالعہ کے لیے چند کتابیں مستعار لیں۔ یہ کتابیں قانون کی تھیں جو انھوں نے چند دنوں میں پڑھ ڈالیں۔ وہ امتحان میں شریک ہوئے اور اول درجہ میں کامیاب ہوئے۔ اب انہوں نے تجارت چھوڑ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

مولوی فدا حسین نے وکالت کے لیے اورنگ آباد کو منتخب کیا اور وہ وہاں چلے گئے۔ اورنگ آباد میں انہوں نے اپنی محنت، دیانت اور قابلیت سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ اور ان کی وکالت چمک نکلی۔ یہیں انہوں نے ایک قانونی رسالہ بھی آئین دکن کے نام سے جاری کیا جس میں حیدر آباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوتے تھے۔ ریاست حیدر آباد میں وکلاء کو ہائی کورٹ کے فیصلوں کو فراہمی میں بڑی دشواری رہتی تھی۔ اب اس رسالے سے یہ دشواری دور ہو گئی اور آئین دکن اورنگ آباد اور دیگر اضلاع کے علاوہ خود شہر حیدر آباد میں بہت مقبول ہوا۔ آئین دکن اب سے ساٹھ ستر برس پہلے ریاست حیدر آباد

کے آئین وقوانین کا اہم ماخذ خیال کیا جاتا تھا۔ [145]

آئین دکن کی شہرت نے مولوی فدا حسین کو حیدرآباد کے قانون داں طبقہ میں ایک خاص مقام دلایا۔ ان کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ اب وہ اورنگ آباد سے شہر منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ ان کا تعمیر کردہ دو منزلہ مکان ... کو ہی اپنی جائے سکونت بنائی۔ چنانچہ ان کا تعمیر کردہ دو منزلہ مکان اب بھی یہاں موجود ہے اسی مکان میں ملک کی سب سے ممتاز شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین پیدا ہوئی جنھیں آزاد اور جمہوری وغیر مذہبی کے صدر کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا تو یہ بھی تجویز حکومت اور عوام کے سامنے پیش نظر رہی کہ اس مکان کو بطور یادگار حکومت اپنی تحویل میں لے لیکن ہنوز یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ مولوی فدا حسین مکان کے اوپری منزل میں رہا کرتے تھے اور نچلے حصہ میں انھوں نے مطبع قائم کیا تھا جس میں آئین دکن کے علاوہ دوسری قانونی کتابیں چھپتی تھیں۔ علاوہ ازیں مولوی فدا حسین کا دفتر وکالت اور کتب خانہ بھی اسی نچلی منزل میں تھا۔ قانونی کتب کی فروخت کا کام بھی ایک نو مسلم انگریز جن کا نام عبد الغنی تھا انجام دیئے کرتے تھے۔ مطبع آئین دکن کے مینجر مولوی عبد الغنی شاہ جہاں پوری تھے۔ مولوی فدا حسین نے قانونی مسائل پر بیس [20] سے زائد کتابیں لکھیں اور یہ ساری کتابیں اسی مطبع میں شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں شرح قانون فوجداری وکیلوں میں کافی مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطۂ فوجداری مع شرح، مجموعہ فیصلہ جات مجلس عالیۂ عدالت قانون اسٹامپ و صداقت نامہ وراثت و رسول عدالت، مجموعہ ضابطۂ دیوانی علاقہ سرکار عالی مع شرح، مجموعہ تعزیرات ملک محروسہ سرکار عالی، قانون مجوبیہ مع شرح بابت معیاد سماعت اور قانون رجسٹری وغیرہ ان کے قانونی تصانیف ہیں۔

مولوی فدا حسین بیمار ہو کر ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد سے اپنے وطن قائم گنج گئے جہاں اسی انچاس [49] سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

ماهنامہ منتخب روزگار

"منتخب روزگار" حیدرآباد سے ربیع الاول ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء میں باہتمام عاشق علی بیگ لکھنوی شائع ہوتا تھا۔ صاحب پرستان آصفی نے اس کے ایڈیٹر کا نام سید علی رضا لکھنوی بتایا ہے[۱] لیکن رسالہ پر کہیں ایڈیٹر کا نام لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس کے چند شمارے ادارۂ ادبیات میں موجود ہیں اور ایک دو مولوی اکبر الدین صاحب کے کتب خانہ میں۔

منتخب روزگار گو اولین رسائل میں شمار ہوتا ہے لیکن ترتیب مضامین کے اعتبار سے ترقی یافتہ تھا۔ چنانچہ حصۂ اول میں علمی اور تعلیمی و ادبی مضامین، حصہ دوم میں ناول اور تیسرا حصہ نظم کا تھا۔ اس کے پہلے شمارہ میں الطاف حسین نے رسالہ کا خیر مقدم کیا ہے اور غلام حسین کنتوری کا مضمون حصۂ اول میں شامل ہے۔ میری جاپرائس مشہور ناول مصنفہ ڈبلیو ایم رینالڈز ترجمہ محمد عباس صاحب اس کے مختلف شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ اس ناول کی وجہ سے اس کی ادبی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے ادبی اور علمی مضامین کا معیار بھی خاصہ بہتر ہوتا تھا چونکہ اس کی پوری جلدیں نہیں مل سکیں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ کب بند ہوا۔

ماہنامہ "افسر"

ماہ نامہ "افسر" انیسویں صدی کے حیدرآبادی رسائل میں خاص اہمیت رکھتا ہے نواب افسر الدولہ حیدرآباد کے نوابوں میں خاص مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے ذاتی

۱۔ پرستان آصفی حصہ دوم ص ۶۸۹

اور شخصی دلچسپی کے خاطر پہلے پہل محرم سنہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں قلعہ گولکنڈہ سے ایک روزنامہ " افسر الاخبار " جاری کیا تھا[1]۔ اور پھر بعد کو صاحب بوستان آصفی کے قول کے مطابق اپریل ۱۸۹۶ء میں ماہ نامہ جاری کیا تھا[2]۔ عابد رضا بیدار نے "افسر" پر مضمون لکھتے ہوئے مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھا ہے کہ "حیدر آباد پہنچ کر علی گڈھ کے گریجویٹ عبدالحق نے عالی جناب نواب میجر افسر الدولہ بہادر کی سرپرستی میں ۱۸۹۹ء میں افسر کے نام سے ایک ماہ نامہ نکالا جو کم از کم ۱۹۰۱ء کے وسط تک ضرور جاری تھا[3]۔ عابد رضا نے بغیر تحقیق کیئے یہ بات لکھدی۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ علی گڈھ سے آنے کے بعد افسر سے وابستہ ہوگئے صحیح ہے لیکن انہوں نے پہلی بار اس رسالہ کو جاری نہیں کیا بلکہ خود افسر الدولہ ماہ نامہ کی اجرائی سے پہلے ہی افسر الاخبار کے نام سے روزنامہ نکالتے تھے بعد کو انہوں نے ۱۸۹۶ء میں ماہنامہ رسالہ نکالا جس کے پہلے ایڈیٹر مشہور صحافی محب حسین تھے۔ اس ضمن میں اکبر الدین صدیقی (صاحب) عابد رضا کی تردید کی ہے چنانچہ انہوں نے لکھا ہے۔ "افسر کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں نکلا جس کے سرورق پہ ابتداء میں چمڑے کے بلٹ کے ساتھ تصویر ہے جو عام طور پر فوجیوں کی کمر میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے جلی قلم میں رسالہ کا نام سیدھا اور الٹا اس طرح ہے افسر، اس کے نیچے ایک سطر میں جلد (۱) بابت ماہ اپریل سنہ ۱۸۹۷ء نمبر (۱)۔ البتہ نمبر، ۱۸۹۷ء کے پرچے میں جو چھٹا شمارہ ہے افسر الدولہ کی سرپرستی اور ممتاز یار جنگ کے اہتمام کے ساتھ مرتبہ محب حسین لکھا ہے اور پھر ڈسمبر ۱۸۹۷ء تک سرورق اس طرح تحریر ہے اس سے کئی اخبار یعنی شفیق، معلم، معلم شفیق، معلم نسواں علم و عمل وغیرہ نکالے۔ منجملہ افسر بھی انہوں نے

---

[1] بوستان آصفی جلد دوم ص ۶۸۹،

[2] بوستان آصفی جلد دوم ص ۶۸۹

[3] ہماری زبان یکم جنوری سنہ ۱۹۶۲ء

چھوڑ رہے ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اورنگ آباد میں مقیم تھے مشہور ادبی رسالہ "اردو" نکالا کرتے تھے جو زبان و بیان کے اعتبار سے منفرد اور مواد کے لحاظ سے گراں قدر تھی۔ مولوی صاحب نے قیام اورنگ آباد ہی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس انجمن کو بہت جلد ریاست بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اصلی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اردو زبان وادب کی خدمت کا کام ایسے وقت شروع کیا تھا جبکہ سلطان العلوم اعلیٰحضرت حضور نظام سابع خود بھی اردو زبان وادب کے عاشق اور شاعر تھے۔ علاوہ ازیں اردو کے لیے فضا ساز گار تھی جیسے ہی مولوی عبدالحق صاحب نے اورنگ آباد میں انجمن کی بناڈالی حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں اس کو بے حد سراہا گیا مختلف معاصرین نے ادارتی نوٹ اور مضامین شائع کیے۔

مولوی عبدالحق کی رسالہ افسر سے وابستگی سے قبل محب حسین ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بلاشبہ محب حسین کو دکن میں بابائے صحافت کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ان کی نکرِ جمیل اور سعی و عمل نے کئی ایک ہفتہ وار اور ماہنامہ رسائل کو نئی زندگی اور توانائی بخشی اور حیدرآباد کی اردو صحافت جلد ترقی کے مدارج طے کر پائی تاہم "افسر" کے اغراض و مقاصد میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آسکی افسر الدولہ کا تعلق افواج آصفی سے تھا اور وہ فوج اصولِ حرب اور سپاہیوں کے کارناموں میں دلچسپی رکھتے تھے اس وجہ سے اگر انھوں نے "افسر" کو محض فوجی ترجمان بنا دیا تھا تو اس میں تعجب بھی نہیں بلکہ اس رسالہ کی بڑی حد تک یہ انفرادیت بھی اور اپنی نوعیت کا ملک بھر میں واحد فوجی رسالہ تھا لیکن ظاہر ہے اس رسالہ کی یہ انفرادیت اس کی مقبولیت میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی چنانچہ مولوی عبدالحق نے اس رسالہ کی ادارت کا کام اپنے ذمہ میں لیا تو انھوں نے اس تخصیص کو ختم کر دیا اور اب "افسر" صرف فوجی ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ادبی و معلوماتی رسالہ بھی بن گیا۔

"افسر" کی پوری جلدیں نایاب ہیں اور جیسا کہ محترم اکبرالدین صاحب صدیقی نے لکھا ہے اس کی چوتھی جلد ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ اس جلد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے ملک بھر کے تمام نامور ادیبوں اور شاعروں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس کے لکھنے والوں کی فہرست میں حقائق آگاہ سید بے نظیر شاہ قادری چشتی نواب عمادالملک، محب حسین، ظفر علیخان

جاری کیا جس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں انھیں کے مطبع میں انھیں کی ترتیب و اہتمام سے چھپا نہ کہ بابائے اردو نے جاری کیا جیسا کہ اکثر حضرات مثلاً رشید احمد صدیقی، افضل صدیقی اور بیدار صاحب نے لکھا ہے"

۱۸۹۸ء میں بھی یہ نکلتا رہا۔ ۱۸۹۹ء میں کچھ دنوں کے لیے بند ہوا۔ ممکن ہے ایک دو شمارے نہ نکلے ہوں پھر بابائے اردو کی ادارت میں نکلنے لگا۔ ۱۹۰۰ء کا مکمل فائیل جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ادارے کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ چوتھی جلد ہے: مولوی اکبر الدین صاحب کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ اپریل ۱۸۹۷ء میں افسر کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور ممکن ہے چار چھ شماروں کی اشاعت کے بعد محب حسین کی خدمات اس رسالہ کے لیے حاصل کی گئی ہوں۔ مانک راؤ نے لکھا ہے محب حسین اس ماہنامہ کے دو سال تک اڈیٹر رہے اس کے بعد مولوی عبد الحق اڈیٹر ہوئے۔ چنانچہ ان کی ادارت میں بھی یہ پرچہ دو سال تک جاری رہا۔ چنانچہ اکبر الدین صدیقی نے بھی لکھا ہے۔" مولوی عبد الحق صاحب نے افسر کی ادارت ۱۹۰۰ء سے قبول کی لیکن اکتوبر سنہ ۱۸۹۹ء سے ان کا تعلق افسر سے ہو گیا تھا نومبر اور دسمبر کے درمیان دو مہینے رسالہ شائع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ان میں کسی شمارے تک رسائی نہ ہو سکی ہے[۱]

بہر حال مانک راؤ وٹھل راؤ کی تحقیق اور خود میرے مطالعہ کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ افسر کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا اور چند شماروں کی اشاعت کے بعد ادارت کی ذمہ داری محب حسین کو سونپی گئی چنانچہ وہ ۱۹۰۰ء تک ان فرائض کو انجام دیتے رہے۔ جب مولوی عبد الحق ۱۸۹۸ء میں علیگڑھ سے حیدر آباد آئے تو تقریباً پانچ سال کے بعد اس رسالہ سے قریب ہوئے اور تقریباً (۲) سال تک یہ پرچہ برابر نکلتا رہا۔

مولوی عبد الحق کی شخصیت ہمہ رنگ اور ہمہ مقصدی رہی ہے۔ وہ بیک وقت معلم ادب اور محقق زبان بھی تھے وہ انشا پرداز بھی تھے اور نقادِ ادب بھی اور صحافت کی دنیا میں انہوں نے اپنے جو نقوش

---

[۱] ہماری زبان ۸ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

عزیز مرزا اور دیگر مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ حیدرآبادی اردو رسائل کی روایت کے مطابق "افسر" میں چھپنے والے بہترین مضمون یا نظم پر بھی مصنف کو ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی۔ اُردو ناول پر ایک نظر" غالباً اپنی نوعیت کا پہلا تنقیدی مضمون ہے جس میں عزیز مرزا نے ناول پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اس کے علاوہ سگلنگ جیسے موضوعات پر معلوماتی مضامین بھی اس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اشرف المخلوقات، اب مردوں کی ضرورت نہیں، چلتے ہوئے پتے کے عنوان پر ہلکے پھلکے طنزیہ مضامین اس رسالہ کے معیار کو بڑھانے کے لیے کافی ہیں۔

حیدرآباد کے دیگر ادبی رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک پنپ نہیں سکا اور چار ساڑھے چار سال تک وقفہ کے ساتھ شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ ان چار ساڑھے چار سالوں میں ابتدائی چار چھ ماہ خود افسر الدولہ نے نگرانی کی بعد کو دو سال تک محب حسین نے ادارت کے فرائض انجام دیئے اور آخر کے دو سال مولوی عبدالحق نے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ادبی نقطۂ نظر سے مولوی عبدالحق کا زمانۂ ادارت افسر کو غیر معمولی اہمیت دلاتا ہے۔ چونکہ چوتھی جلد ہی دستیاب ہو سکی اس لیے صرف جنوری سنہ ۱۹۰۰ء کے مضامین کی فہرست دی جا رہی ہے۔

عزیز الاخبار و تکمیل الاحکام

حیدرآباد کے اُردو رسائل اپنے موضوعات کے اعتبار سے متنوع مند بھی اور منفرد بھی ہوتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ آج جب کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی ہو رہی ہے لیکن سائنس طب، ٹکنالوجی، انجینیرنگ اور اگریکلچر کے موضوع پر صرف حیدرآباد ہی پر کیا منحصر ہے پورے ملک سے کوئی بھی معیاری رسالہ شائع نہیں ہوتا جبکہ حیدرآباد میں صحافت کے ابتدائی دور میں ان تمام موضوعات پر معیاری اور معلوماتی رسائل شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ زراعت سے متعلق معلوماتی اور مفید رسالہ سب سے پہلے عزیز جنگ ولا نے سنہ ۱۹۰۰ء میں جاری کیا۔ ان کے بعد ان کی تقلید میں فصیح الدین احمد نے رسالہ مالگزاری (سنہ ۱۹۰۴ء) آر آر جوشی نے رسالہ زراعت (۱۹۱۳ء) اور اسی نام سے

۱۹۴۷ء میں منیر الدین نے رسالے جاری کیے۔ عزیز جنگ ولا کے رسالوں "عزیز الاخبار" اور "تکمیل الاحکام" کی اہمیت کئی اور اعتبارات سے ہماری صحافت میں ہے جس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے ربع اول کے ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ حیدرآباد کے لیے صرف عزیز جنگ کی ذات تھی۔ اس زمانے کے مصنفین اور مولفین کو ان کے وجود سے گرانقدر مدد ملتی رہی۔ ان کی زندگی حیدرآباد کی ایک ایسی زندہ تاریخ تھی جس سے یہاں کی معاشرت، یہاں کے رسم و رواج اور یہاں کے علمی کارناموں کی جھلکیاں نظر آتی تھیں"۔

اور تو اور خود شمس العلمأ الطاف حسین حالی نے بھی اپنے ہم عصر کے علمی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں جن لوگوں نے زمانۂ حال میں اپنی گراں بہا تصنیفات سے اردو زبان کو سرمایہ دار بنایا ہے اور اپنی لٹریری قابلیت سے جس قدر خود فائدہ اٹھایا ہے اس سے بہت زیادہ فائدہ پبلک کو پہنچایا ہے ان میں نواب عزیز جنگ بہادر کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے"۔

جس طرح حضرت ولا نے قانون و لغت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اسی طرح زراعت کے سلسلہ میں اپنی صحافت کے ذریعہ ترقی کے امکانات کو روشن کیا ہے۔ ویسے تو انہوں نے دو رسالے عزیز الاخبار (اردو) اور لسان الہند و العجم (فارسی) جاری کیے لیکن تاریخ اردو صحافت میں عزیز الاخبار اور پندرہ روزہ تکمیل الاحکام کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ عزیز الاخبار کے بارے میں وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات "حیوۃ العزیز" میں رقم طراز ہیں!

"ایک معینہ مدت تک میں اس موقت الشیوع ہفتہ واری رسالہ کا پروپرائٹر اور ایڈیٹر رہ چکا ہوں جس کا نام عزیز الاخبار تھا۔ اس میں بیرونی خبروں کے علاوہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی خبریں اور قانون مال و فینانس کے مضامین رہا کرتے تھے۔ اس کا سالانہ چندہ بقدر مصارف طبع تھا۔ اس اخبار کے جاری کرنے سے مقصد صرف یہی تھا کہ پبلک کو مدد ملے۔ زمانے کی آب و ہوا نے اس پودے کو آزادی رائے کے ساتھ سرسبز نہ ہونے دیا اور میں نے ناگوار پابندیوں کے ساتھ اس کے جاری رکھنے پر بند کر دینے کو فائق خیال کیا۔

۲) اس کے بعد رسالہ (لسان الہند والعجم) کی اشاعت ایک معینہ زمانے تک رہی جو ماہواری اور علمی رسالہ تھا۔"

ان دونوں رسائل کے علاوہ ان کا ایک اور رسالہ تھا جو عزیز الاخبار ہی کے ساتھ سنہ ۱۹۰۰ء میں تکمیل الاحکام کے نام سے جاری ہوا تھا اور جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے کافی اہم سمجھا جاتا تھا۔ عزیز الاخبار کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ اس میں الفاظ سے بحث کیجاتی تھی اور اسمیں مالگزاری کی گشتیات بھی مسلسل طبع ہوا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس اخبار کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ لیکن تکمیل الاحکام کی اہمیت دوہری تھی۔ اس میں ان تمام باتوں کے علاوہ کاشت کے اصولوں سے بحث کیجاتی تھی۔ اور زراعت سے متعلق معلومات فراہم کئے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ حیدرآباد سے نکلنے والا منفرد رسالہ تھا۔ اس رسالہ کی اشاعت کے بارے میں عزیز جنگ نے لکھا تھا۔

" اس رسالہ کے شیوع کی منظوری سرکار نظام سے بذریعہ مراسلہ معتمد صاحب اول نمبر نشان ۴ ۳ آذر سنہ ۱۳۱۰ف م ۸ جمادی الثانی سنہ ۱۳۱۸ھ ہو چکی ہے۔"

یہ رسالہ چار حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ حصہ اول زراعتی مضامین، دوم محبوب القوانین، سوم مجموعہ قوانین مالگزاری، حصہ چہارم مصطلحات دکن۔

حصہ اول کی وجہ سے تکمیل الاحکام کاشت کاروں میں مقبول ہوا۔ حصہ دوم اور سوم کی وجہ سے تعلقداران ضلع نے اس کی افادیت و اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کا حصہ چہارم ادبی نقطۂ نظر سے آج بھی اہمیت رکھتا ہے۔ نظام حکومت کے دور میں جو اصطلاحات رائج تھے ان کا مطالعہ مقصود ہو تو اس سلسلہ میں تکمیل الاحکام کی پرانی فائلیں مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

ذائقہ کی تبدیلی کے لیے اسمیں طویل نظمیں بالاقساط بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ جن شعراء کا کلام اسمیں شائع ہوا ہے ان میں منشی احمد حسین خاں، محمد عبد الغفور شہباز، نادر علیخاں نادر، سید امجد علی اشہری اور تفضل حسین تعلی شامل ہیں اور اکثر نظمیں رسالہ مخزن سے نقل ہوا کرتی تھیں۔ ان تمام خوبیوں نے تکمیل الاحکام کو مقبول عام رسالہ بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جبکہ تعلیم عام نہیں تھی

اور اخبار بینی کا شوق قال قال ہی تھا تکمیل الاحکام کی تقریباً تعداد اشاعت تین سو تھی۔

ماہنامہ "دکن ریویو"

"دکن ریویو" حیدرآباد کے قدیم رسائل میں اپنے ترجموں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور یہی بات اس کی شہرت کی وجہ بھی بن گئی۔ ظفر علیخان خود بھی صاحب طرز انشاپرداز تھے وہ بحیثیت شاعر کوئی اونچا مقام رکھتے ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی تحریر کی شوخی اور ترجمہ کی سلاست اور سادگی بحیثیت ادیب ناموری کے لیے کافی ہے۔ ان کے مشہور ترجموں میں "بلن دی ماسٹر پلیس (مصنفہ کپلنگ) دی جنگل بک (مصنفہ رڈیارڈ کپلنگ) الفاروق (مصنفہ شبلی نعمانی) اور پوشیا (مصنفہ لارڈ کرزن) بے حد مقبول ہوئے۔ ان ناولوں اور کتابوں کو انھوں نے اشرف المخلوقات، جنگل میں منگل، الفاروق اور خیابان کے نام سے اردو میں منتقل کر کے سرمایہ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ویسے بھی ترجمہ کا کام جان لیوا ہوتا ہے لیکن ظفر علیخان کی انگریزی زبان سے بخوبی واقفیت اور اردو زبان پر قدرت نے اس کام کو ان کے لیے سہل اور آسان بنادیا۔ اردو زبان و ادب میں ترجمہ کی ہمیشہ ہی سے کمی محسوس کیجاتی رہی ہے۔ آج بھی جبکہ انگریزی عام ہوچکی ہے اچھے ناولوں اور کتابوں کے ترجمے نایاب ہیں۔ دکن ریویو اس حیثیت سے آج بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ترجمہ شدہ ناولوں اور کتابوں کو شائع کیا گیا۔ خصوصاً انگلستان کے جادونگار افسانہ نویس مسٹر رینالڈس کی مشہور و مقبول اور معرکتہ الآراء تصنیف "مسٹریز آف لنڈن" کا ترجمہ بنام "فسانۂ لندن" دکن ریویو کے ذریعہ اردو ادب میں منتقل کیا گیا۔ گو ابتداء میں اس افسانہ کو کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی لیکن جب علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔

ظفر علیخاں نے مشن ہائی اسکول وزیر آباد سے مڈل کا امتحان پاس کیا پھر پٹیالہ گئے۔ علیگڈھ میں داخلہ لیا سنہ ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا۔ محسن الملک کے پرائیوٹ سکریٹری رہے اور وہاں سے حیدرآباد پہنچے۔ فوج میں ملازم ہوئے پھر دارالترجمہ میں جگہ ملی حضور نظام مرحوم نے انھیں "خیابان فارسی" کے ترجمہ پر تین ہزار کی رقم عطا کی۔ لارڈ کرزن اسے ٹلائی ... کی جھڑکی پیش کی۔ فسانۂ عجائب ... سیر ظلمات

اور معرکہ مذہب و سائنس اس زمانہ کی یادگار ہیں "جنگ روس و جاپان" کے نام سے ڈرامہ لکھا اور اس دور میں "دکن ریویو" کے نام سے ۱۹۰۴ء میں ایک علمی رسالہ نکالا۔ حیدر آباد میں سازش کی وجہ سے اسکی ادارت چھوڑنی پڑی اور آخر انگریزوں کے خلاف سازش کے الزام میں ریاست سے نکل جانا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۶ء کا ہے۔ حیدر آباد چھوڑ کر وہ شمالی لینڈ چلے گئے اور اس سال بمبئی واپس پہنچ کر ٹائمس آف انڈیا بلڈنگ سے اس کا پہلا نمبر نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ اور جب ۱۹۰۷ء میں سرکار حضور نظام نے شہر بدری کے احکامات کو منسوخ کر دیا تو وہ حیدر آباد پہنچ کر پھر ایک بار دکن ریویو کو جاری کیا۔ چنانچہ شبیر الحق دسنوی کے بموجب "عدیم الفرصتی کے باعث مارچ و اپریل ۱۹۰۹ء (نمبر ۵-۶) کے مشترکہ پرچے کی اشاعت کے بعد ظفر علی خان صاحب نے دکن ریویو کی ملکیت کا حق اور ایڈیٹری کا سید مودود احمد قادری تنہ باغ سالک رام حیدر آباد کے نام منتقل کر دی جن کی ادارت میں مئی ۱۹۰۹ء سے یہ پرچہ نکلنا شروع ہوا[1]

"ہماری زبان" نے اردو رسائل پر ۶۲ اور ۶۳ کے دوران مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ یکم فبروری ۱۹۶۲ء ہی کے شمارہ میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اور شبیر الحق دسنوی نے "دکن ریویو" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ "رسالہ دکن ریویو" جو حیدر آباد سے مولوی ظفر علی خاں صاحب مرحوم ماہوار شائع کرتے تھے رسالہ نمبر ۹ جلد دوم ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے ٹائیٹل پیج پر چار مینار کا نقشہ ہے اور اس کے اوپر زیر سرپرستی مہاراجہ یمین السلطنت کے سی آئی ای دام اقبالہ وزیر اعظم دولت آصفیہ درج ہے۔ چار مینار کے نیچے جلی حروف میں "افسانہ" اس کے نیچے یہ عبارت ہے۔

"اعلیٰ درجہ کے انگریزی ناولوں کے تراجم کا ماہوار رسالہ"

شبیر الحق دسنوی نے قدرے تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے اس مضمون کے بعد مستقل بحث کا آغاز ہو گیا چنانچہ بعد کو ابن علی بدایونی کا مضمون اس سال یکم اگسٹ شمارے میں شائع ہوا۔ ان دونوں مضامین کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں

---

[1] ہماری زبان یکم فبروری ۶۲ء

شبیر الحق نے لکھا ہے کہ "اس رسالے کی جلدیں پٹنہ کے ایک کتب خانہ میں محفوظ ہیں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پسور کے الاصلاح لائبریری میں رسالہ ہذا کی پانچ جلدیں محفوظ پائی جاتی ہیں۔ ان جلدوں کے بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن ریویو کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۰۴ئ سے پہلے مولانا ظفر علیخان صاحب حیدر آباد سے یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں جولائی سنہ ۱۹۰۲ئ سے افسانہ کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس میں موصوف "مسٹریز آف لندن" کا ترجمہ بنام فسانۂ لندن شائع کرتے تھے۔ اس افسانہ کی پہلی جلد ۱۹۰۳ئ کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔

جنوری ۱۹۰۴ئ سے صاحب موصوف نے دکن ریویو نکالنا شروع کیا اور رسالہ افسانہ کو دکن ریویو کے ساتھ ضم کر دیا

تیسری جلد کی تکمیل کے بعد ایڈیٹر مولوی ظفر علیخان صاحب کی طبیعت بری طرح ناساز ہو گئی اور ان کی شدید علالت کے باعث اکتوبر ۱۹۰۶ئ تک دکن ریویو بند رہا۔ اور نومبر ۱۹۰۶ئ میں دکن ریویو سلسلۂ جدید جلد (۱) شمارہ (۱) ٹائمز آف انڈیا بلڈنگ سے نکلنا شروع ہوا۔ دسمبر ۱۹۰۶ئ کا رسالہ جلد (۱) نمبر (۱) بھی بمبئی ہی سے شائع ہوا۔ جنوری، فروری ۱۹۰۷ئ کے پرچے (۳۔۴) بمبئی میں تیار رکھے تھے مگر ایڈیٹر ظفر علی خان کے دفعتاً حیدر آباد چلے آنے کی وجہ سے ان کی اشاعت معرض التوائی میں آ گئی اور یہ دونوں مشترکہ نمبر ناظرین کی خدمت میں حیدر آباد سے بھیجے گئے۔ پھر مارچ ۱۹۰۷ئ سے سلسلہ جدید کے پرچے حیدر آباد سے نکلنے لگے مگر وقت کی پابندی ان پرچوں کی اشاعت میں کبھی ملحوظ نہیں رہی۔ اپریل مئی جون، جولائی، اگسٹ ۱۹۰۷ئ کا مشترکہ نمبر اسلام نمبر سلک اول کے نام سے نکلا اور ستمبر اکتوبر ۱۹۰۷ئ نمبر (۱۱۔۱۲) کا مشترکہ نمبر جس پر اس سلسلہ جدید جلد اول کا خاتمہ ہوا۔ اسلام نمبر سلک دوم قرار پایا۔ اس جلد میں جسٹس بدر الدین طیب جی، سر کریم بھائی، ابراہیم امیر حبیب اللہ خان فرماں روائے افغانستان سلطان ٹرکی شاہ اف پرشیا کے فوٹو شائع ہوئے ہیں۔ رسالہ کی پہلی دو جلدیں کتابی سائز پر نکلی تھیں۔

ایڈیٹر کے عرض مدعا ماہ گذشتہ موقع مشاہیر اُردو فارسی غزلیں اور نظمیں، کتابوں رسالوں اور اخباروں کے ریویو کے عنوان سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔"

دکن ریویو کے بمبئی سے شائع ہونے اور ظفر علیخان کے شہر بدر ہونے کے بعد شمالی لینڈ پہنچ جانے کی داستان کو ابن علی بدایونی نے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ کسی طرح ظفر علیخان پہلے پہل حیدرآباد پہنچے اور "افسانہ" کی اشاعت کا اصل سبب کیا ہے جو اس مضمون سے ان ساری باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"واقعہ تو یہ ہے کہ ۱۸۹۵ء میں مولوی ظفر علیخان صاحب مرحوم اور میرے والد مولوی سید محفوظ علیخاں بدایونی طالب شدہ نے ایم اے او کالج علی گڈھ سے ایک ساتھ بی۔ اے پاس کیا اول الذکر نے حیدرآباد (دکن) پہنچ کر ملازمت اختیار کی اور حضرت قبلہ گاہی صاحب مرحوم ریاست خیر پور سندھ میں نائب وزیر مقرر ہو گئے۔

۱۸۹۸ء کے اوائل میں حضرت قبلہ خیر پور سے مستعفی ہو کر بدایوں اپنے وطن تشریف لائے۔ کچھ دنوں بعد اپنے ہم سبق اور عزیز دوست مولوی عبدالحق صاحب مرحوم (بابائے اُردو) اور مولوی ظفر علیخاں صاحب کے اصرار پر حیدرآباد (دکن) پہنچے اور ملازم ہو گئے۔ ان تینوں دوستوں کے رسالے "افسانہ" نے ایک ایسی ہی نشست میں جنم لیا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور والد مرحوم کو رسالہ "افسانہ" اور مسٹریز آف لندن "ناپسند تھے کچھ دن بعد افسانہ بند کر دیا گیا اور جنوری سنہ ۱۹۰۴ء سے دکن ریویو نکلنا شروع ہوا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قبلہ و کعبہ مولوی سید محفوظ علی صاحب نے اپنے نام سے لکھنے کے بجائے اکثر فرضی ناموں سے مضامین لکھے۔ چنانچہ دکن ریویو میں بھی کمتر مضامین اپنے نام سے اور بیشتر مضامین نقاشی اور دوسرے ناموں سے لکھتے تھے ۱۹۰۴ء ہی کے دوران سر تھیوڈور ماریسن پرنسپل ایم۔اے۔او۔ کالج علیگڈھ کی سفارش پر برٹش ہائی کمشنر لندن کے دفتر سے میرے والد صاحب مرحوم کو شمالی لینڈ افریقہ کے شہر بدبدہ میں مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا "افریقہ کا مسافر" وہ خط ہے جو انہوں نے جہاز پر سے مولوی ظفر علیخاں صاحب کو لکھا تھا اور جو دکن ریویو میں شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک نظم "ذاکر نامہ" لکھنے کے سلسلے میں مولوی ظفر علی

خان صاحب ریاست حیدر آباد کی ملازمت سے برطرف اور شہر بدر کر دیئے گئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء میں وہ قبلہ گاہی صاحب مرحوم کے پاس شمالی لینڈ پہنچ گئے اور دکن ریویو بند ہو گیا۔ دوستی کے تعلقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ والد مرحوم نے اولاً چھ ماہ کی رخصت حاصل کی اور پھر ملازمت کو خیرباد کہہ کر حق دوستی کی خاطر اپنے دس ہزار روپیہ کے سرمایہ سے بمبئی میں کاروبار شروع کر دیا۔ کالبا دیوی روڈ بمبئی میں ایم اے بشیر اینڈ کو کے نام سے دکان کھولی گئی۔ ظفر علیخاں صاحب شریک کاروبار تھے لیکن ظفر علیخان کو دکن ریویو کی یاد بے چین کئے رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بمبئی سے اس کا احیا کیا (آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بمبئی سے دکن ریویو کیوں نکلا)۔

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور ظفر علیخاں صاحب ایک دوسرے ہمدرد شہر بدری کے احکام کے منسوخ کرانے اور ان کے باز ماموری حیدر آباد کے لیے دو سال سے کوشاں تھے۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں یہ کوشش بار آور ہوئیں اور ظفر علیخاں صاحب حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔ دکن ریویو ایک بار پھر حیدر آباد سے نکلنے لگا۔" ؎۱

ابن علی بدایوں نے ممکن ہو ظفر علیخاں اور اپنے والد بزرگوار کے تعلقات کے بارے میں کسی قدر مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہو لیکن بات صد فیصد غلط نہیں ہے۔ خود ظفر علیخان مرحوم نے اپنے "دور دراز دریائی سفر" کا ذکر بمبئی سے شائع ہونے والے دکن ریویو کے پہلے شمارہ میں کیا ہے۔ بمبئی سے دکن ریویو کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس شمارہ کے اداریہ میں "عرضِ مدعا" کے زیر عنوان رقمطراز ہیں۔

کچھ عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دکن ریویو ناظرین کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف پھر حاصل کرتا ہے۔ ہم نے جب جنوری سنہ رواں میں اپنے ناظرین کو اطلاع دی تھی کہ بوجہ علالت ہم مجبور ہیں کہ رسالہ کی اشاعت برائے چندے ملتوی کریں تو ہمیں خیال نہ تھا کہ سلسلہ علالت اس قدر طول کھینچے گا اور ہمیں بغرض تبدیلی آب و ہوا ایک دور دراز دریائی سفر پر جانا پڑے گا۔ بہرحال

؎۱ ہماری زبان (علی گڑھ) یکم اگست ۱۹۶۲ء

خدا کا شکر ہے کہ اب ہم صحت یاب ہو کر ناظرین کی خدمت گذاری کے لیے تیار ہیں۔"

"دکن ریویو کا مولود و وطن مملکت ابد مدت آصفیہ کا دارالحکومت ہے۔ ہماری دلی خواہش تو یہ تھی کہ یہ مولود نشو و نما پاکر سن رشد و شباب کی منزلیں یہیں طے کرتا لیکن دکن ریویو کے بعض سرپرستوں کے اصرار اور ان بہت سی آسانیوں کے خیال نے جو ہندوستان کے لندن اور دنیا کے تجارت کے ایشیائی مرکز یعنی بمبئی ہی ہر قسم کے کاروبار والے کو حاصل ہیں آمادہ کیا کہ دکن ریویو کے سلسلۂ جدید کی اشاعت یہیں سے ہو۔" [1]

اس اداریہ کو پڑھنے کے بعد ابن علی بدایونی کے بہت سے دعووں کی تصدیق ہوتی ہے کہ ظفر علیخاں شہر بدر ہونے کے بعد حیدرآباد سے شمالی ہند گئے تھے وہاں سے واپس آنے کے بعد بمبئی کو اس وجہ سے منتخب کیا کہ وہاں "بعض سرپرستوں" کا اصرار تھا کہ رسالہ بمبئی سے شائع ہو۔ بہرحال بمبئی سے تقریباً دوبارہ حیدرآباد واپس ہونے تک شائع ہوتا رہا اور جب وہ حیدرآباد آئے تو انہوں نے چند دنوں تک دکن ریویو کو نکالنے کے بعد اس رسالہ کو سید مودود احمد قادری کے حوالے کیا اور خود پنجاب سے "زمیندار" کو جاری کیا جو ہندوستان کے چند گنے چنے سیاسی رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو عوامی شعور کو بیدار کرنے اور آزادی کے نعرہ کو عام کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا۔

"دکن ریویو" دکن کے ان ماہناموں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے دنیائے ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں بلاشبہ اس رسالہ کی عمر کوئی طویل نہیں ہے اور جب بھی نکلا ہے تو ہمیشہ غیر یقینی حالات میں اس کی وجہ خود ایڈیٹر کی زندگی کے مدوجزر ہیں۔ ظفر علیخان ہندوستان کی قومی تحریک سے وابستہ ان معنوں میں نہیں رہے جیسے محمد علی جوہر اور شوکت علی رہے ہیں اس وجہ سے دکن ریویو "کامریڈ" نہیں بن سکا۔ خود دکن میں مضبوط شخصی حکومت قائم تھی اور اسی زمانہ میں بادشاہت سے بغاوت کا کوئی تصور بھی نہیں تھا بلکہ بادشاہ ظل سبحانی سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے ظفر علیخاں نیم سیاسی آدمی ہونے کے باوجود دکن ریویو محض ادبی، سماجی اور مذہبی رسالہ تھا ہاں کبھی

---

[1] دکن ریویو نومبر ۱۹۰۶ء

کبھی انڈین نیشنل کانگریس پر ایک آدھ مضمون ضرور شائع ہوتا رہا ہے۔ بلکہ بعد کو پنجاب سے شائع ہونے والے "زمیندار" اور دکن ریویو میں خود فرق موجود ہے یہ فرق درحقیقت ان سیاسی حالات کا ہے جو شمال اور دکن میں موجود تھے۔ دکن کی گود میں آباد خوابوں کی بستی۔ حیدرآباد ۱۹۴۷ء سے پہلے تک طوفان خیز تبدیلیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے ہمیشہ محفوظ رہی اسی وجہ سے یہاں سے نکلنے والے اخبارات اور رسائل میں سنسنی اور تہلکہ خیزی کا کوئی شائبہ بھی موجود نہیں تھا بلکہ ان رسائل و اخبارات کی توجہ اصلاح تہذیب اور اصلاح معاشرہ پر لگی رہی۔ دکن ریویو بھی اپنے پیشرو رسائل کی طرح تہذیبی سماجی مذہبی اور ادبی مضامین کو پیش کرتا رہا ہے

ظفر علیخاں شاعر اور ادیب بھی تھے اس وجہ سے دکن ریویو کے معنوی حسن میں اضافہ کرنے کے لیے انھوں نے ہندگیر شہرت رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کیا۔ ظفر علی خان خود بھی لکھتے تھے ان کے علاوہ محفوظ علی سلطان احمد خان، مظہر حسن، عزیز الدین (منشی کانٹ) راحت حسین، اشرف شمسی اور سید کرامت حسین بیرسٹر ایٹ لا الہ آباد وغیرہ کے علاوہ دیگر ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شامل ہوا کرتی تھیں۔

جب دکن ریویو کا سلسلہ جدید شروع ہوا تو ملک بھر کے تمام روزناموں اور رسائل نے اس کا خیر مقدم کیا۔ مشیر اعظم (مرادآباد) رسالہ ید بیضا (سکندرآباد۔ بلند شہر) اور مخبر دکن (مدراس) نے اس پر تبصرے کیے۔

مولوی مرزا ہادی عزیز لکھنوی کی رائے میں "ہندوستان کے تمام اور اردو رسائل میں بہ اعتبار مذاق علمی اگر کوئی رسالہ ہے تو یہی ہے۔ میں اس رسالہ کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ ہوں" ایسے ہی خواہوں کی تعداد جو ہر ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے کم نہ تھی۔ سلسلہ جدید کے لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر لعل نجم دلگیر اکبرآبادی، رضا علی وحشت معشوق حسین جواد علی عالی، مولوی عبدالحق اور شبلی نعمانی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان کی مشترکہ اہمیت آج سے نہیں قدیم سے ہے۔ قومی تاریخ میں ساٹھ سال کا عرصہ کوئی معمولی تو نہیں ہوتا زمانہ بدل جاتا ہے نسلیں جگہ چھوڑ جاتی ہیں نئی قدروں اور نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے اور ڈھلتے ہوئے لمحوں میں یہی جدیدیت کہنگی کا لباس اوڑھ

لیتی ہے یا پھر "لباس فاخرہ" اڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن سچائی جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے زیادہ حقیقت افروز اور ٹھوس بنتی جاتی ہے۔ ڈپٹی لال نگم نے ایسی ہی ٹھوس اور مضبوط سچائی کو اپنے مضمون "ہندی قوم اور قومی زبان" میں منکشف کیا تھا ؎

"چونکہ آج کل مشترکہ زبان بنانے کا چرچا بہت زوروں پر ہے۔ اس لیے اگر جلدی ہی کوئی زبان اس غرض کے لیے تجویز کر دی گئی تو بہتر ہوگا۔ ورنہ عرصہ دراز گزرنے کے بعد ممکن ہے کہ یہ جوش اور گرما گرمی سرد پڑ جائے۔ سنسکرت یا عربی کو مشترکہ زبان بنانے کے وقت تک اس جوش و خروش کا ٹھنڈا پڑ جانا ممکنات سے ہے اور پھر یہی مثل صادق آئے گی کہ "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" پس ایک قوم کے ممبر ہونے کے لیے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو ہی کو قومی و علمی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کریں۔"

ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں شہر آرزو رودِ موسیٰ کی طغیانی کے لپیٹ میں آگیا۔ دکن کی گود میں آباد یہ خوابوں کی بستی آبِ موسیٰ میں گھر گئی جو جانی و مالی نقصانات ہوئے اس کا اندازہ امرِ محال ہے۔ اس تعلق سے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے واقعات و حادثات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء کے شمارے میں دکن ریویو نے تفصیلی مضمون شائع کیا۔ اداریہ لکھا۔ اس طغیانی میں خود دکن ریویو کا اکتوبر کا شمارہ نذرِ آب ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بادشاہ وقت میر محبوب علیخان اور ولیعہد میر عثمان علیخان نے جو امدادی کام کیا تھا اس کو بھی مستحسن نگاہوں سے دیکھا گیا اس سلسلہ میں اکتوبر کا یہ شمارہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔

دکن ریویو کے شمارہ فبروری سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس مقابلہ میں اول آنے والے مضمون نگار کو مبلغ (۵۰) روپیے انعام دیا گیا۔ اس سلسلہ میں نظام الدین احمد ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا انڈر سکریٹری مجلس وضع آئین و قوانین کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اور اراکین میں شبلی نعمانی، بشیر الدین احمد ناظم نظم جمعیت، سید نور الضیا الدین صاحب مفتی عدالت العالیہ مولوی حبیب الدین اسسٹنٹ فنانشیل سکریٹری

۱؎ دکن ریویو اگسٹ سنہ ۱۹۰۸ء ص ۷۴

اور ملا عبد القیوم صاحب معتمد مجاز ریلوے شامل تھے۔ سید جلال اور سید ابراہیم کے مضامین کو انعام کے مستحق قرار دیا گیا۔ چنانچہ دونوں مضمون نگاروں میں مبلغ (۱۵) (۱۵) روپیہ تقسیم کیے گئے اور مضامین "مصنوعات دکن" کے عنوان سے نکلے شماروں میں شائع کیے گئے۔

مختصر یہ کہ دکن کے ادبی رسائل کی تاریخ میں "دکن ریویو" اہم ترین رسالہ ہے اور اس کے تذکرہ کے بغیر تاریخ صحافت دکن مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

ماہنامہ "صحیفہ"

حیدرآباد کی صحافت پر جب بھی قلم اٹھایا جائے گا "صحیفہ" کے کارناموں پر روشنی ڈالنا مورخ کے لیے ضروری ہے۔ صحیفہ خادم ادب بھی تھا اور "دورِ آصفی کا سب سے پہلا خادم ملک وملت" بھی۔ صحیفہ عرصہ دراز تک ماہ نامہ کی حیثیت سے ادب اور ادبی مسائل کو پیش کرتا رہا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے صحیفہ نے اپنے پیش رو ماہ ناموں سے کہیں زیادہ سلجھا ہوا طریقہ عمل اختیار کیا اور زیادہ مدلل بحثیں کرتا رہا یہی بات اسے اپنے ہمعصر ماہ ناموں میں امتیازی مقام دلاتی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں "موسوم بہ اسم تاریخی" صحیفہ کے نام سے جاری ہوا لیکن قلیل مدت کے لئے بند ہوا۔ اس وقت تک رضی الدین حسن کیفی ہی اس رسالہ کے مالک مہتمم اور مدیر تھے لیکن جب انجمن معارف کے زیر اہتمام اس کی دوبارہ اشاعت ۱۹۱۰ء میں عمل میں لائی گئی تو اس ادارت کی ذمہ داری اکبر علی کو سونپی گئی ۱۹۱۲ء تک یہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا اور اس کے بعد روزنامہ میں بدل دیا گیا۔ اب صحیفہ ہر روز شام میں شائع ہونے والا خادم ملک وملت بن گیا تھا اور اکبر علی کے انتقال ۱۳۶۰ھ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

کیفی روایت شکن شاعر تھے اور جن موضوعات پر انھوں نے نظمیں کہی ہیں ان کے پیش نظر نصیر الدین ہاشمی نے انھیں دکن کا حالی قرار دیا ہے [1]

---

[1] دکن میں اردو (بار سوم) ص ۹۴۴

کیفی صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی تھے چنانچہ انھوں نے اپنے رسالہ صحیفہ میں "اصولِ تنقید" پر خود قلم اٹھایا اور دوسروں کو بھی تنقیدی مضامین لکھنے پر اکسایا چنانچہ عجیب و غریب توارد کے عنوان سے تسلی کا آمد آورد پر قول فیصل کے زیر عنوان ملچہ کا مضمون جو جلیل اور بازنم کے کلام میں توارد اور سید جلال کے مضمون کا جواب تھا شائع ہوئے ان علمی اور تنقیدی بحثوں سے فن اور ادب کے کئی گوشے بے نقاب ہوئے۔

۱۹۰۵ء سے صحیفہ جاری تو ہوا تھا لیکن "جشنِ عشرت" کی مسرت میں شائع ہونے والا یہ ماہ نامہ بہت جلد بند ہوگیا۔ بعد کو انجمن معارف کی جانب سے ۱۳۲۸ھ کو پھر جاری ہوا اس بار اکبر علی بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک کار رہے اور دفتر صحیفہ واقع بیرون دروازہ چادر گھاٹ منتقل ہوگیا۔

محمد اکبر علی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے مدرسۂ تعلیم المعلمین سے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور دار العلوم میں شریک ہوگئے جہاں سے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحان کامیاب کرکے صدر محاسبی میں ملازم ہوگئے۔ لیکن بہت جلد غلامی کا جوا اتار پھینکا اور اخبار نویس کا پیشہ اختیار کرلیا۔[۵۱] صحیفہ سے منسلک ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء میں صحیفہ کو ماہ نامہ سے روز نامہ میں بدل دیا۔

"صحیفہ" ادبی اور تنقیدی مضامین کے لیے مشہور تھا۔ صحیفہ کی اشاعت تک ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسے مسائل پر بحثیں شروع ہوچکی تھیں۔ کیفی ادبی نقاد تھے لیکن انھوں نے ادب کے باہر زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی جرأتِ رندانہ فرمائی چنانچہ یہ بات خود ان کے کلام سے عیاں ہے کہ انھوں نے ادب اور شاعری کو رنگ و روپ کا نہیں تیشہ زنی کا فن بنایا۔ سماجی موضوعات پر قلم اٹھایا اور زندگی کے مسائل کو زبان شعر میں کہنے کی سعی جمیل کی۔ صحیفہ پر بھی اس فکر جمیل کی پرچھائیں نظر آتی

۵۱۔ حیدر آباد کے ادیب ص ۲۷۹

ہی۔ رسالہ صحیفہ کو محمد مرتضیٰ، محمد مظہر، ظفر حسن، عبدالرزاق بسمل، عبدالوہاب عندلیب، محمد مصطفیٰ ملمہ حیدرآبادی، تسلی حیدرآبادی، اللہ بخش، ملا عبدالباسط، مولوی عبدالقدیر اور اکبر علی کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ اس رسالہ میں جہاں ادبی مضامین شائع ہوتے رہے وہیں مذہبی سیاسی اور تاریخی مضامین کو بھی جگہ ملتی رہی۔ ۱۹۱۲ء کو جب صحیفہ روزنامہ میں بدل گیا بحیثیت رسالہ اس کی زندگی کے دن پورے ہوئے لیکن روزنامہ میں بھی تاریخی اور ادبی مضامین کو جگہ ملتی رہی۔ صحیفہ حیدرآباد کا قدیم اخبار ہونے کی وجہ سے اکبر علی مرحوم کو اس کی قدامت پر بڑا ناز تھا چنانچہ اس کے سرنامہ پر تحریر تھا.... سب سے قدیم خادم ملک وملت" اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کو شائع ہوا تھا۔

دبدبۂ آصفی

"فسانۂ آزاد" کا مصنف تلاش روزگار میں اپنے ہمعصروں کی طرح حیدرآباد پہنچا تو قدردانوں نے ہمت افزائی کی دلاسہ دیا اور مہاراجہ کشن پرشاد کی امداد و اعانت سے صحیفہ نگار بن گیا۔ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو یہ ناول نگار ایک ماہ نامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں داخل ہوا۔

دبدبۂ آصفی کی جلد اول شمارہ (۱) کے سرورق پر لکھا ہے۔

"اعلیحضرت نظام الملک آصفجاہ میر محبوب علیخان بہادر کی تقریب سالگرہ مبارک کی تہنیت میں یہ ماہوار رسالہ جس میں نظم ونسق کے اخلاقی، علمی سوشیل شریفانہ مضامین ہونگے اور جس کے بانی مانی عالیجناب راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد المتخلص بہ شاد دام اقبالہٗ پیشکار و وزیر افواج سرکار عالی ہیں۔"

حسب الارشاد مہتم الیہ زیر نگرانی ٹھاکر پرشاد صاحب شوق، اداریہ میں "دبدبۂ آصفی" کی پالیسی کے بارے میں درج ہے۔

کئی سال ہوئے راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد مہاراجہ بہادر وزیر فوج آصفی دام اقبالہ کی آرزو تھی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ ماہواری اردو زبان میں اس طرح شائع ہو جس طرح انگریزی رسالے نکلتے ہیں کیونکہ اردو میں گو اخبار ں کی اشاعت بفضلہ کثرت سے ہے اور ماہانہ اور مہینے میں دو بار ہفت وار ہفتہ میں دو بار روزانہ طبع ہوتے ہیں اور مثل جام جہاں نما ہیں ہم لوگ گھر بیٹھے تمام دنیا کے حال سے واقفیت حاصل کرتے ہیں مگر اس قسم کے رسالے کی اشد ضرورت تھی جیسے (فورٹ نائٹلی ریویو) یا نیشنل میگزین یا کوارٹر ریویو) وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ دبدبہ کو اس نہج پر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ پالٹکس سے بحث نہیں کی گئی، مذہبی جھگڑوں سے دامن بچایا گیا اور کل مضامین میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیا گیا۔ ہاں ظریفانہ خیالات پر مشتمل مضامین .... شائع ہوا کرتے تھے کیونکہ بقول سرشار ہم آدمی محرم کی پیدائش نہیں ہیں۔ لیکن ظرافت میں کوئی مضمون نگار دائرہ اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا جہاں تک سرشار کی پرورش کا معاملہ تھا مہاراجہ شاد نے "بطیب خاطر" اس کا منافع سرشار کے نام سے محفوظ کر دیا تھا۔

جہاں تک اس رسالے کے ادبی معیار کا تعلق ہے مختلف موضوعات پر اسی قدیم انداز میں بحث ہوا کرتی تھی شعر و شاعری کے زیر عنوان تصحیح شعر اور زبان و بیان کی غلطیوں کا جائزہ لیا جاتا طویل مضامین سے اجتناب برتا جاتا چنانچہ دبدبۂ آصفی کے شمارہ صفر المظفر ۱۳۱۶ھ میں سرشار نے ایک مضمون نگار کے بارے میں لکھا ہے۔ "بعض مضامین نامہ نگاران و نیشان نے ایسے بھیجے جن کی نسبت عنوان مندرجہ بالا (طویل املی) کی پھبتی ٹھیک عائد ہوتی ہے مضمون کیا ہیں کہ طویل املی سے بھی کہیں زیادہ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جائے اور ناظرین کو اس کڑی منزل میں چلتے چلتے تھک کے زبانِ حال و قال دونوں سے غیبر الدولہ منشی منظفر علیخاں آمیر لکھنوی کا یہ مصرعہ پڑھنا پڑے

ہیں سست قدم دن کوئی دو چار گھڑی کا ہے۔

مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین میں بہترین مضمون پر اشرفی دی جاتی تھی چنانچہ حکیم برہم ۔ مضمون پر اشرفی دی گئی وہ تھا "اردو ہندوستان کی عام زبان ہے۔" مہاراجہ کشن پرشاد کے تصنیف کردہ ناول "چنچل نار" اور "بحر امواج" اس ماہ نامہ کے صفحات پر پہلی بار شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ خود سرشار کے بیشتر مضامین کے علاوہ شیطان کی آنت اس ماہ نامہ کی زینت کو بڑھاتے رہے ہیں۔ "دبدبہ" میں دلچسپ اقتباسات شائع ہوا کرتے تھے۔

جہاں تک زندگی کے سنجیدہ مسائل کا تعلق ہے دبدبہ نے ایسے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے چنانچہ "اردو ہندوستان کی زبان ہے" ایسا مضمون ہے جبکہ ہندوستان میں ہندی اور اردو کا تنازعہ زوروں پر تھا اور اس لسانی مسئلہ کی وجہ سے عام طور پر ہندو مسلم تعلقات میں تناؤ پیدا ہو چکا تھا اس تعلق سے حکیم برہم نے لکھا ہے "ہر ایک شخص خواہ وہ ہندو یا مسلمان اگر اس کے مزاج میں صلاحیت ہو تو بالطبع ایسے امور کو ناپسند کرے گا جن سے ہندو اور مسلمان کے برادرانہ اور سوشیل تعلقات پر ناگوار اثر پڑنا ممکن ہو۔ بالخصوص عام ملکی زبان کی نسبت کسی قسم کا اظہار اختلاف بہر حال قابلِ نفرت ہے جس نے اردو اور ہندی کے نام سے ایک مکروہ سوال کی صورت اختیار کی ہے۔ ہندوستان کی یہ دو نامی قومیں جنھیں سرسید مرحوم نے دلہن کی دو آنکھوں سے ایک موقع پر تشبیہ دی تھی جہاں اور فروعی مخالفتوں میں مبتلا ہیں اس میں بدقسمتی سے ناگوار سوال نے نہایت منحوس اضافہ کر دیا ہے۔ (دبدبہ ربیع الثانی سنہ ۲۲ھ ص ۹)

عزیز الدین خان عزیز شاکر لکھنوی حیدر لکھنوی مرزا اکرم علی رنگ رائے، منوہر لعل زتشی لکھنوی سید محمد منصبدار رفیع الدین رفعت وغیرہ شامل ہیں۔ ہیرا لعل نائب مدیر اور شوق مہتمم رسالہ کی حیثیت سے "دبدبہ" سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں سرشار کثرت شراب نوشی کی وجہ سے تقریباً دو ماہ علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ جس کی وجہ سے دبدبہ کی اشاعت بھی موقوف ہو گئی۔

ماہنامہ "تاج"

ماہ نامہ "تاج" اپنے وقت کا مقبول رسالہ تھا اور دیگر ہمعصر رسائل میں سب سے زیادہ معیاری اور وقیع سمجھا جاتا تھا۔ جنوری ۱۹۱۴ء کو اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور انگریزی مہینے کی آخری ہفتے میں اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی اس کا مستقل حجم ۳۲ صفحہ تھا اور اس محدود صفحات کے باوجود معیاری مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا غلام محمد اسعدی وفا نے "تاج" کی پالیسی پر پہلے ہی شمارہ میں اظہار خیال کیا ہے۔ "ہم نے یہ قصد مصمم کر لیا کہ تاج جاری کر کے اخبارات و رسائل کی قلیل تعداد میں ایک ماہوار رسالہ کا اضافہ کریں اور سیاست سے الگ رہ کر گورنمنٹ سے محض اشاعت تعلیم کا مطالبہ کریں جو ملک و قوم کی بہبود و ترقی کی ذمہ دار ہے۔۔ ہم حیدرآباد کی موجودہ معاشرت میں جو محض کورانہ تقلید کا بہترین نمونہ ہے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم ملک میں بہترین خیالات کی اشاعت کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اور ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ زبان اردو کے خزانہ کو عمدہ زبان کی دولت سے مالا مال کریں" وفا کے اس دعویٰ پر مجھے محبوب حسین جگر کے وہ الفاظ یاد آئے جو انھوں نے حیدرآبادی رسائل و اخبارات کے تعلق سے کہا تھا۔ ان کے خیال میں "قدیم جاگیردارانہ ریاست حیدرآباد کے سیاسی و سماجی شعور کے ارتقاء میں نہ صرف یہ کہ یہاں کے اخباروں کا اہم حصہ رہا ہے بلکہ یہ کہ اخبارات ہی نے اس مصنوعی اور آمرانہ ماحول کو ختم کرنے میں پہل اور قیادت کی ہے"[1] دراصل قدامت پرستی اور وفا کے الفاظ میں حیدرآباد کی معاشرت میں جو کورانہ تقلید رواتھی اس کے خلاف سب سے پہلے جو آواز بلند ہوئی وہ "تاج" ہی کی تھی معاشرہ کی فرسودہ قدریں اور مذہب کے غلط تصور نے سماج کو خرافات میں الجھا دیا تھا روایت پرستی عام تھی۔ تاج کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ اس روایت کو توڑا جائے اور مذہب اسلام کا صحیح تصور عام ہو چنانچہ عام شماروں میں اخلاقیات اور اسلامیات کے علاوہ جنوری ۱۹۱۶ء کا شمارہ "میلاد نمبر" نکالا گیا۔ اس سے وفا کی اسلام سے وابستگی اور وفاداری کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۔ مجلہ عثمانیہ (جامعہ عثمانیہ نمبر) ص ۷۵

"تاج" مذہبی ادرہ تمدنی اعتبار سے روایت شکن ماہ نامہ تھا اس وجہ سے بہت جلد ہمہ گیر شہرت کا مالک بن گیا۔ معاشرتی اور سماجی پالیسی کے علاوہ اردو زبان وادب کی خدمت بھی اس کے فرائض میں داخل تھی چنانچہ علمی وادبی مضامین جگہ پاتے رہے ہیں۔ تائید اردو علم وادب (رضی الدین کیفی) اکبر اور اس کا مرتبہ (خواجہ احمد) قومی تعلیم (محمود حسن) اور فسانہ دنیا کے ترجمہ از نظم لارڈ الزبیدٹینسن (احسن صدیقی) تاج کے ادبی اور علمی مضامین میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک تاریخ زبان اُردو کا تعلق ہے تاج یا شاید سب سے پہلی بار" اردوئے معلّیٰ" کے عنوان سے سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے مضمون لکھا۔[1] اس مضمون میں ہوش بلگرامی نے اُردو زبان کی تاریخ سے بحث کی ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ "ہند میں اُردو زبان کی بُنیاد اس وقت پڑی جبکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے جنگی و تہذیبی فتوحات کے سیلاب عظیم کا رُخ افغانستان کے سر بفلک کشیدہ پہاڑوں کی بلندیوں سے ہندوستان کے میدانوں کی طرف پھرا۔" گو یہ نظریہ جدید تحقیق سے باطل قرار پاتا ہے لیکن اس مضمون کی اس سے اہمیت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی جبکہ اُردو زبان کی تاریخ تاریکی میں تھی اس قسم کے مضامین کا لکھنا اور مباحث کا چھیڑنا بجائے خود اہم بات ہے۔

"تاج" مسلسل چار سال تک جاری رہا لیکن مالیہ کی مشکلات کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ البتہ پھر ۱۹۲۳ء میں اس کے سلسلۂ جدید کا آغاز ہوا۔ چنانچہ وفا اس کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔ "دورِ قدیم بہت ہی مایوس کن ثابت ہوا باوجود تین چار سال کی انتھک کوششوں کے ہم نے دیکھ لیا کہ نہ صرف علم دوست اصحاب نے ہی اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی بلکہ ملک کے بہی خواہ حضرات نے بھی توسیع اشاعت میں حصہ نہیں لیا جس سے نیاز مند نے ساڑھے چار ہزار روپیہ کی کثیر رقم کے نقصان اٹھا کر کے بادل ناخواستہ تاج کو الوداع کہا۔" لیکن دورِ جدید بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور چند سالوں کے بعد یہ رسالہ پھر بند ہو گیا۔

"تاج" کے مضمون نگاروں میں رضی الدین کیفی، سید ہاشمی، حامد حسین قادری، ذہین رعد، محمد حسین آزاد حیدرآبادی لمعہ، محمد احسن شمس اللہ قادری اور نصیر الدین ہاشمی، سلطان احمد، آغا حیدر حسن دہلوی، عماد الملک اور ہوش بلگرامی شامل تھے۔ رسالہ "معارف" کی رائے میں یہ رسالہ ہندوستان کے بعض

---

[1] تاج۔ جولائی ۱۹۱۵ء ص ٣٦

مشہور پرچوں سے بھی کم نہیں تھا اور رسالہ اردو کی رائے تھی کہ حیدرآباد سے نکلنے والے پرچوں سے بہترین رسالہ تھا۔[1] سید شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" دراصل "تاریخ" ہی کا ایک خاص شمارہ تھی۔

ماہنامہ "ذخیرہ"

ماہ نامہ "ذخیرہ" کی اشاعت ذخیرہ پریس اندرونِ دروازہ چادرگھاٹ سے ماہ اکٹوبر ۱۹۱۵ء سے عمل میں آئی۔ حیدرآباد کے قدیم و جدید رسائل کی طرح یہ بھی بیک وقت علمی، ادبی اور مذہبی مضامین پیش کرتا رہا۔ قیمت فی پرچہ ۶/ ہوا کرتی تھی اور کوئی ۴۸ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ تین سال تک شائع ہونے کے بعد صاحب بوستان آصفی کے مطابق ۱۹۱۸ء میں اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔[2] اس ماہ نامہ کے مرتب سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) تھے۔

ہوش بلگرامی ادب میں بحیثیت ادیب، شاعروں میں بحیثیت شاعر اور سیاستدانوں میں بحیثیت سیاستدان اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ذہین آدمی تھے اور مزاج داں بھی، اس وجہ سے سیاست کے میدان میں اپنا سکہ خوب چلایا اور کنگ کوٹھی کی فضا میں بہت جلد ان کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن بقول محترمہ زینت ساجدہ دربار داری کے اس فن نے انھیں بنایا بھی اور بگاڑا بھی۔[3] شاعری میں کوئی بڑا مقام پیدا نہ کر سکے البتہ نثر میں انکی ایک ابتدائی کتاب بدیہہ گوئی پر شائع ہوئی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ ان کے تصانیف میں عروسِ ادب، ہماری بتا پرستیاں اور مشاہدات مثنوی طوفانِ محبت قابلِ ذکر ہیں۔ وہ بلگرام کے رہنے والے تھے لیکن عنفوانِ شباب میں حیدرآباد چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی حیدرآباد ہی میں ہوا جہاں انہوں نے سنہ ۱۹۱۵ء میں ذخیرہ جاری کیا جو سنہ ۱۹۱۸ء تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں شہر بدر

۱۔ دکن میں اردو بار سوم ص ۵۵۱ ۲۔ بستان آصفی (جلد سوم) مولفہ مانک راؤ وٹھل راؤ۔ ۳۔ حیدرآباد کے ادیب۔ جلد دوم ص ۱۶۸

ہو ئے تو ذخیرہ بھی بند ہو گیا۔

جب "ذخیرہ" کا پہلا شمارہ ملک بھر کے ادبی اور نیم ادبی حلقوں میں پہنچا تو ہر طرف سے تعریف وتحسین کا سلسلہ شروع ہوا اور ملک بھر کے تمام شہروں سے امید افزا رائیں دی گئیں چنانچہ "ذخیرہ" ہی کے صفحات پر "ہمارے باب میں ہوئی ہے۔ گفتگو کیا۔ کے زیر عنوان مختلف اخباروں کی آرا شائع کیں۔ نومبر ۱۹۱۵ء کے شمارے میں جن اخبارات کی رائے پیش کی گئی ہے ان میں اخبار "مساوات (الہ آباد) دبدبۂ سکندری (رامپور) نیر اعظم (مراد آباد) مدینہ (بجنور) مشرق (گورکھپور) اور اخبار اہلحدیث (امرتسر) شامل ہے

ذخیرہ حیدر آباد کے ان چند گنے چنے رسائل میں سے ہے جس کے معیار نے ادب کو اونچا کیا اور جدید اصناف نثر اور نئے موضوعات پر ادیبوں کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے لکھنے والوں میں عماد الملک کے علاوہ انجاز لکھنوی، سید حسن بلگرامی، سید علی اصغر بلگرامی، درد حیدر آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد، نظم طباطبائی غلام مصطفی ذہین، اظہر دہلوی، عشرت لکھنوی، سلطان احمد ضمیر نقوی، تیرتھ رام، مفتی انوار الحق، فخر لکھنوی، سید شاہ ولی الدین چشتی، سلطان حیدر جوش، حیدر یار جنگ، عبد اللطیف، خواجہ حسن نظامی، پریم چند اور عبد الماجد قابلِ ذکر ہیں۔ اس فہرست کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ "ذخیرہ" نے اردو ادب کے ذخیرہ میں جو اضافہ کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے اور ہمارے شعر و ادب کا ناقابلِ فراموش رویہ ہے۔ حصہ نظم علٰحدہ فہرست کے ساتھ رسالہ کے نصف سے کم آخری حصہ میں شائع ہو اکرتا تھا۔ جن شعرا کا تعاونِ عمل ذخیرہ کو حاصل رہا ہے ان میں ملک کے تقریباً سبھی بڑے بڑے شاعر شامل تھے۔

ہوش بلگرامی نے ایڈیٹوریل کے رواج کے بجائے مضامین پر نوٹ لکھنے کو اختیار کیا البتہ ذخیرہ کے دوسرے شمارہ میں صفحۂ آخر پر جو ایڈیٹوریل لکھا گیا اس میں اردو زبان و ادب کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور نہ ہی رسالہ کے بارے میں کوئی بات۔ بلکہ خواجہ کمال الدین ایڈیٹر رسالہ مسلم انڈیا کا تعارف کرایا گیا ہے

اردو تنقید کی تاریخ بڑی مختصر ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شبلی اور حالی کی وجہ سے شعور تنقید عام ہوا۔ لیکن جدید اصولوں کی تدوین اور واضح نقطۂ نظر ۱۹۳۵ء کے بعد جبکہ ترقی پسند تحریک کا چرچا ہوا تنقید میں

پیش کیا جانے لگا۔ خصوصاً سائنٹفک تنقید تو اس ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ رسائل و جرائد میں تنقیدی مضامین یا تو سرے سے شائع ہی نہیں ہوتے تھے اور اگر کہیں نظر بھی آجائے تو ان کی تعداد تو بڑی مختصر ہوا کرتی تھی۔ اور ان مضامین کا انداز بھی بڑی حد تک تبصروں کا سا ہوا کرتا تھا۔ "ذخیرہ" میں اس قسم کے مضامین کی بہتات نہ سہی لیکن کمی بھی نظر نہیں آتی۔ غلام مصطفیٰ ذہین شاعر تو تھے ہی لیکن ناقدانہ نظر بھی رکھتے تھے علی حیدر اظہر دہلوی اور عبدالماجد کے علاوہ خود ہوش نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ یہ بھی نقاد حالی اور شبلی کے نظریات تنقید کا اچھا مطالعہ کرتے تھے اور ان کی تنقیدات میں یہی رنگ جھلکتا ہے لیکن نظریہ تنقید اور اصول نقد کا جہاں تک تعلق ہے حالی اور شبلی سے گریز اور محض ادب کے پیش نظر تنقید کی گئی ہے۔ حالی کے نظریہ شعری نے شعر و زبان کی دنیا میں نیا انقلاب تازہ کیا تھا۔ جن سے نئے رجحانات اور نئے میلانات کو اردو شاعری میں روشناس کرایا گیا ایسا معلوم ہوتا ہے بعد کے نقادوں نے کما حقہ اس سے استفادہ نہیں کیا تا آنکہ ترقی پسندوں کا دور آتا ہے۔ ویسے بھی جن نقادوں کے نام اوپر دئیے گئے ہیں ان میں مشہور نقاد شاید ہی کوئی ہے سوائے مولانا ماجد کے اور مولانا ماجد تنقید کے اس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں جسے رومانویت پسند کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں مولانا ماجد کے نظریہ تنقید سے بحث نہیں صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ مولانا ماجد کی تنقید ذخیرہ کے دیگر نقادوں سے کہیں زیادہ شعوری اور اصولی ہو گئی کیونکہ ذہین شاد اور خود ہوش کے بیان تنقید یا ادب کا نیا شعور اتنا واضح نہیں ہو سکتا جتنا کہ مولانا کا ہو سکتا تھا۔ اور پھر ذخیرہ کا زمانہ ترقی پسند رجحانات سے بہت پہلے کا ہے تاہم ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے بیان بھی دیگر ہمعصر نقادوں کی طرح حالی کا سماجی اور ثقافتی و تاریخی شعور پایا نہیں جاتا۔ مولانا ماجد ادب کو ادب ہی کی عینک سے دیکھنا جانتے ہیں اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذخیرہ کا معیار تنقید کوئی زیادہ قابل احترام ور نہیں ہے اور نہ ہی ترقی کی طرف کوئی اہم نشاندہی کرتا ہے۔

"ذخیرہ" کی افادیت تنقیدی نہ سہی افسانوی ضرور ہے افسانہ کا فن نیا ہوتے ہوئے بھی اس رسالہ کے ذریعہ عام ہوا۔ ذخیرہ کے افسانہ نگاروں میں ملک مشہور ادیب شامل ہیں۔ اردو افسانہ کا ارتقا بڑی حد تک پریم چند کا مرہون منت ہے۔ گو اس کی ابتدا سلطان حیدر جوش نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم

سے ہوتی ہے لیکن پریم چند سے اُردو کے پہلے افسانہ نگاروں کا مستقبل بنتا ہے۔ سلطان حیدر جوش یلدرم اور نیاز تینوں بھی روایت پسند کہانی نگار ہیں جن پر جن وپری کا اثر نمایاں ہے۔ پریم چند وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے کہانی میں انسانی زندگی کو پیش کیا ہے اور اُردو افسانہ کو اس طرح حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ پریم چند مشہور افسانہ درگاہ کا مندر (ذخیرہ جلد ۶۔ ۱) ذخیرہ کی صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ ذخیرہ کو تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کا تعاون عمل حاصل رہا ہے۔ ذخیرہ میں شائع افسانوں میں سے بعض کا انداز داستانوں کا سا ہے اور بعض کا بچوں کی سی کہانیوں کا، تاہم یہ دور بہر حال اُردو افسانہ کا ابتدائی دور ہے اس وجہ سے بڑی حد تک ناقابل نظر انداز ہے۔ درحقیقت افسانہ کی ترقی کا زمانہ بھی اُردو تنقید کی طرح سنہ ۱۹۲۵ء کے بعد کا ہے جبکہ اُردو ادب شاعر اور افسانہ نگار حالی، شبلی اور سر سید کی کوششوں کی وجہ سے انگریزی علم وادب سے مانوس اور پھر بعد کو اچھی طرح واقف ہو چلے تھے۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے پریم چند کی افسانہ نگاری نقش اوّلین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے حیدرآباد کے رسائل میں "مکتبہ" بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا اس کی تقریباً پوری جلدیں ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں پہلا اور درمیان کے چند ایک شمارے غائب ہیں مختصر سی مدت میں "ذخیرہ" نے اُردو ادب وزبان کی جو خدمات انجام دی ہیں اُردو صحافت کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔"

ماہنامہ ثمرۃ الادب

حیدرآباد کی ابتدائی انجمنوں میں انجمن ثمرۃ الادب ادبی برکات کا سبب بنی۔ پہلے پہل سنہ ۱۸۹۴ء میں اس کا قیام مدرسہ دارالعلوم میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کے مقاصد میں علمی وادبی ذوق عام کرنا اور نوجوانوں میں تقریری وتحریری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا تھا چنانچہ اس کی جانب سے ہفتہ وار توسیعی لکچر ہوا کرتے تھے۔ مولوی عبدالباسط رضی الدین کیفی، اکبر علی اور مولوی محمد مظہر اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ سے انجمن سے وابستہ رہے۔ مولوی عبدالقدیر صدیقی حسرت اس انجمن کے معتمد تھے لیکن چند سال کام کرنے کے بعد یہ انجمن معطل ہو گئی لیکن ۱۹۱۴ء میں جب مولوی

حمید الدین صاحب دارالعلوم کے صدر ہوئے تو پھر سے اس کا احیاء ہوا۔ اور اس کی اعلیٰ کارکردگی کو دیکھ کر سرکار نے امداد بھی مقرر کی۔ انجمن کے چوتھے سال یعنی ۱۹۱۸ء میں ایک علمی اور اخلاقی ماہوار رسالہ "ثمرۃ الادب" بھی جاری ہوا۔ اس انجمن کے نشاۃ ثانیہ کے بعد چار سال تک نصیر الدین ہاشمی مرحوم بھی معتمدی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ثمرۃ الادب کی ادارت کی ذمہ داری عبدالواسع کے سر آئی اور نصیر الدین ہاشمی اس کے مینیجر ہو گئے۔

اس رسالہ کی اجرائی کا مقصد جہاں اساتذہ کو اصول تعلیم اور تعلیمی مسائل سے آگاہ کرنا تھا وہیں طالب علموں میں علم کی لگن پیدا کرنا اور تعلیم کے مقصد کو عام کرنا تھا۔ علاوہ ازیں ان میں تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی اس رسالہ کا مقصد رہا ہے۔ اس ماہ نامہ میں جہاں اساتذہ کے مضامین ہوا کرتے تھے وہیں طلباء کی کاوشوں کو بھی جگہ دی جاتی تھی اس وجہ سے ایک علمی اور ادبی ماحول پیدا کرنے میں ثمرۃ الادب نے نمایاں حصہ لیا ہے اس ماہ نامہ میں جن ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو جگہ ملتی تھی ان میں امجد جلیل فصاحت جنگ اور مولوی عبدالحق کے نام سرفہرست ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی عبدالرب کوکب صفا زاہد کریم اور امرت لعل بھی ثمرۃ الادب کے مستقل لکھنے والے تھے۔

ثمرۃ الادب ایک سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

ماہنامہ "النساء"

بیگم صغرا ہمایوں مرزا حیدرآباد کی نسوانی دنیا میں نئی زندگی پیدا کرنے اور خواتین دکن کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے آگے بڑھ کر علمی میدان میں کام کرنے والی خواتین میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں سید ہمایوں مرزا سے شادی ہوئی۔ سید ہمایوں مرزا فریاد عظیم آبادی کے فرزند تھے۔ یہی وہ فریاد ہیں جو شاد عظیم آبادی کے استاد تھے۔ صغرا جس خاندان میں بیاہی گئی تھیں وہاں علمی اور شعری ماحول پہلے ہی سے موجود تھا اس لیے انھوں نے خود بھی باضابطہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ حیا تخلص اختیار کیا اور جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ شعر کے ساتھ ساتھ انھیں نثر سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ بحیثیت ناول نگار مشہور رہیں۔ ان کے بیشتر ناول خود ماہ نامہ "النساء" کے رہین منت ہیں۔ "ہاجرہ کی سرگذشت" اور "موہنی"

ماہانہ قسط وار شائع ہوئے ان کے دیگر ناولوں میں زہرہ بی بی طوری کا خواب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا کے یہاں جو بات دیگر ناول نگاروں سے مختلف اور منفرد نظر آتی ہے وہ خیال پر زور دیتا ہے۔ ان کے ناولوں میں زبان اور فن کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں دی گئی جتنی کے اسے خیال سے مرصع کرنے کے کی کوشش کی گئی۔ ان کی تصانیف کی تعداد تگ بھگ پندرہ ہے۔ اس تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ادب سے کس قدر دلچسپی تھی۔

صغرا ہمایوں مرزا نے خواتین میں عام بیداری پیدا کرنے کے لیے ۱۹۱۲ء میں لیڈی خدیو جنگ مرحوم کے ہمراہ انجمن خواتین اسلام قائم کی جس کی صدر لیڈی خدیو جنگ اور آپ سکریٹری تھیں۔ جب ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں "النساء" کی اجرائی عمل میں آئی تو اس رسالہ کے ذریعہ انجمن کی خبریں پہنچانے میں سہولت ہوگئی بلکہ "النساء" بڑی حد تک انجمن خواتین کا آرگن بن گیا۔ اور سالانہ جلسہ کی رپورٹ بھی اس رسالہ میں شائع کی جانے لگی خواتین دکن میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے صرف انجمن ہی سے کام نہیں لیا بلکہ "النساء" بھی اس سلسلے میں ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ چنانچہ نوجوان لڑکیوں میں لکھنے کی عادت پیدا کرنے اور ادب کی طرف ترغیب دلانے کے لیے بہتر مضامین پر سونے اور چاندی کے تمغے دینے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ ؎ "یہ طے کیا ہے کہ اس سال میں جن کے مضامین عمدہ ہوں گے ان کو میڈل دیا جائے گا۔ مضامین قصوں کے پیرایہ میں تاریخی یا نامور عورتوں کے حالات ہوں ایک سونے کا دو چاندی کے میڈل ہوں گے جو بہترین مضامین پر دیے جائیں گے۔ اس رسالہ اور انجمن کو خواتین دکن کی پوری پوری ہمدردی اور تعاون حاصل تھا چنانچہ صغرا ہمایوں مرزا نے پہلا شمارہ چھوٹی رانی صاحبہ یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کو بھیجا گیا تو انھوں نے ایک خط کے ساتھ اٹھی روپیے بھیجے منجانب مہاراجہ بہادر ماہانہ مبلغ (۵) اور منجانب رانی صاحبہ ماہانہ (۳) مالی امداد کا یقین دلایا۔

"النساء" نے جس انداز میں خواتین کی رہبری و رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا تھا وہ درحقیقت ایسد ضرورت تھا عورتوں کی تعلیم اور تربیت ایک اچھے معاشرہ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ عورتوں کی تعلیم پر ہر دور اور ہر زمانہ میں زور دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کے ادبی رسائل میں سب سے پہلے "معلم نسواں (محب حسین) نے اس طرف توجہ دلائی۔ درحقیقت "النساء" نے اس ماثاثہ سے روشنی لی ہے۔ جن مسائل کو "النساء" میں پیش کیا جاتا رہا ہے وہ عورتوں کی تعلیم، پردہ، زکوٰۃ، سلیقہ، صبر و استقلال شہادت کا فلسفہ اور

گیا،پردہ نشینیانِ ہند کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ ممکن ہے وغیرہ ہیں۔ اس قسم کے مذہبی اور نیم سماجی مسائل سے ہٹ کر بھی اہلیہ باٹی، صبح عیدؔ دوستی اور اس کے اقسام، بیربہٹ خانہ نکات حکمت، ہم بوڑھے کیونکر ہو جاتے ہیں وغیرہ جیسے دلچسپ اور معلوماتی مضامین شائع ہوتے تھے۔

"النساء" کی دوسری اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کے لکھنے والوں میں صنفِ نازک کی تعداد بڑھی ہوئی ہوتی تھی اس کے لکھنے والوں میں جہاں ہمایوں مرزا خان، احمد حسین، سید محمد ہادی، علی حیدر طباطبائی مولوی عبدالحق، عبدالقادر اور محب حسین شامل تھے وہیں خود صغریٰ ہمایوں مرزا، محل نواب محمد عمر خان، زنانہ محل بیرالدین، رگھیبر، امیر بیگم، جہاں آرا بیگم، مسز باور علی، مس ظفر الدین، بلقیس بیگم، فاطمہ بیگم، نوشابہ خاتون زہرہ، اختر محمودہ، رفیعہ سلطانہ، مس طیبہ، سارا بیگم اور فاطمہ صغرا، خورشید نذیر، بیگم وغیرہ بھی شامل تھے۔

المختصر صغرا ہمایوں مرزا نے "النساء" کے ذریعہ خواتین دکن کی جو خدمت انجام دی ہے اس کو آنے والی نسلیں فراموش نہیں کر سکیں۔ "النساء" نے جس نہج پر خواتین کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا تھا اس سے انداز میں کام کو آگے بڑھانے کی آج بھی ضرورت ہے۔ خصوصاً آج جبکہ خواتین میں تعلیم عام ہے ایک ایسے پرچے کی سخت ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں عورتوں کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکے۔

ماھنامہ ارتقاء

اُردو ادب کا یہ ماہوار رسالہ ۱۹۲۱ء سے جاری ہوا اور اپنے ادبی معیار کی وجہ سے بہت حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں کامیاب ہو گیا اس کے لکھنے والوں میں عبداللہ المسدوسی احمد الدین احمد زور ولایت حمد ابوالکلام فیض محمد غلام محی صاحب صفری نظامی سروری مرز سعیدی تمکین کاظمی اور ناصر علی بیگ وغیرہ شریک تھے۔

ارتقا میں ادبی مضامین کے علاوہ مذہبی مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ مولوی افضل شریف صاحب کا رجحان ابتداً ہی سے مذہب اور تبلیغ مذہب کی طرف رہا ہے۔ "ارتقاء" مالی مشکلات کے سبب زیادہ دنوں تک نہ چل سکا تو ماہانہ دیندار سنہ ۱۹۵۷ء سے جاری کیا۔ افضل شریف صاحب کا انتقال ڈسمبر سنہ ۱۹۶۵ء میں ہوا۔

ماہنامہ رسالہ تحفہ

حیدرآباد کے قدیم محلہ سرورنگر میں نوجوانوں نے اسکول اور کالج کی زندگی سے ہٹ کر اپنی نئی انجمن کی بنائے ڈالی جہاں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں اس "انجمن ارباب اردو" کی جانب سے ایک ماہوار رسالہ "تحفہ" بھی شائع کیا جانے لگا۔ یہ بات ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۳ء کی ہے۔ اس پرچہ کے مہتم دوارکا پرشاد نگم تھے جو اپنے وقت کے اچھے انشا پرداز اور باذوق نوجوان سمجھے جاتے تھے۔ چند مہینوں تک یہ رسالہ شائع ہونے کے بعد مالی دشواریوں کا شکار ہوگیا۔ عالی نے تحفہ کی اجرائی کے سلسلہ میں جن حضرت کا شکریہ ادا کیا ان سبھوں کا تعلق انجمن سے تھا ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کئی باذوق حضرات کے تعاون عمل سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس انجمن کو نوجوانوں کے ساتھ ساتھ تجربہ کار اور بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا بھی تعاون حاصل تھا۔ چنانچہ اس بات کو ٹھیک طور پر اس وقت محسوس کر سکتے ہیں جب ہم "تحفہ" کے شماروں کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ تحفہ کی عمر بمشکل تمام ایک سال تھی لیکن جو معیار اس نے قائم کیا تھا وہ خالص ادبی اور علمی تھا اس میں آمیزش نہیں تھی۔ تحفہ تاریخ جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ میں تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

عالی رفائی نے اس کے پہلے اداریہ میں انجمن ہی کی نہیں عوام کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس قسم کے مضامین تحفہ کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں جن میں قیام کلیہ پر فخر کا اظہار کیا گیا اردو زبان سے والہانہ عشق ظاہر کیا گیا۔ حضور نظام سابع سے بے پناہ عقیدت جتلائی گئی اور حیدرآباد کو دیگر معاصر ریاستوں میں برتر ثابت کیا گیا۔ یہ ساری باتیں یوں ہی نہیں تھیں واقعہ تھیں۔

ڈاکٹر زور نے اس رسالہ کے نویں شمارہ میں "جامعہ عثمانیہ" کے عنوان پر مضمون لکھا ہے اس رسالہ میں مولوی عبدالستار صاحب[1] نائب صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ (۱۳۳۲ف) کا وہ مضمون بھی شائع

---

[1] موصوف پروفیسر عبدالقادر پرنسپل آرٹس کالج کے بہنوئی اور سید احمد کبیر صاحب اور مولوی غلام احمد صاحب کے ہم زلف تھے

ہوا ہے جو انھوں نے انجمنِ اتحاد کے سالانہ جلسہ ۱۹۶۷ء میں بعنوان "عثمانیہ یونیورسٹی اور تاجدارِ دکن"
پڑھا تھا۔

"تحفہ" کو طلبہ اور اساتذہ سبھوں کا تعاون و اشتراک حاصل تھا۔ اس رسالہ میں ادبی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ خالص انشائیہ اور معلوماتی مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں ایک سال کے اندر اندر اس ماہ نامہ نے ادب و زبان کا شستہ معیار چھوڑا ہے جو بعد کے رسائل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ فہرست مضامین کی ادبی اہمیت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

مجلہ عثمانیہ

اگست ۱۹۱۹ء کا مہینہ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس کی صبح کو جامعہ کی افتتاحی رسم انجام پائی۔ اور انٹرمیڈیٹ کی کلاس کا آغاز ہوا۔ اور اسی مبارک دن سے عثمانین کی علمی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز بھی ہوا۔ چند سالوں کے بعد انجمن اتحاد طلبا کی بناڈالی گئی لیکن ابھی تک کوئی ایسا خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ جس کی وجہ سے کوئی ترجمان شائع ہوتا۔ قیام جامعہ عثمانیہ کے ۸ سال بعد مجلہ عثمانیہ کی اجرائی عمل میں آئی۔ بدر شکیب نے اپنے زمانۂ طالب علمی کی یادوں کو یکجا کرتے ہوئے اس مجلہ کی اجرائی کا واقعہ لکھا ہے۔ [1]

"قریشی کابینہ نے اجرائی رسالہ کے مسئلہ کو بڑی عدو مد سے اٹھایا۔ مولوی عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جو انجمن طلبائے کے بھی صدر تھے بعض وجوہات کی بناء پر رسالہ کو طلبا کے ہاتھ میں دینے تیار نہ تھے بالآخر باب کلیہ کو انجمن طلبائے کا یہ مطالبہ قبول کرنا پڑا۔ مجلہ عثمانیہ کا نام قریشی کا تجویز کردہ ہے جس کو پروفیسر وحید الدین سلیم نے بہت پسند کیا۔ کابینہ انجمن طلبائے نے قریشی اور ڈاکٹر زور کو شعبہ اردو کی ادارت کے لیے منتخب کیا۔" اس طرح گویا مجلہ عثمانیہ کا پہلا شمارہ فبروری ۱۹۲۶ء کو نکلا۔ ۱۹۴۸ء تک یہ رسالہ سہ ماہی تھا لیکن آج کل سالنامہ کی صورت میں ہر سال شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کی اجرائی کے سلسلہ میں معین الدین قریشی اور ڈاکٹر زور کی کوششوں کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔

---

[1] مجلہ عثمانیہ۔ جامعہ عثمانیہ نمبر ص ۸۳

چنانچہ یہی دونوں طلبا اُس کے پہلے مدیرین کی حیثیت سے نامزد بھی ہوئے تھے۔ اس کے پہلے شمارہ میں خلیفہ عبدالحکیم، حبیب اللہ رشدی، عبدالقادر سروری، سید وقار احمد، احمد عارف، اور مرزا الم نشرح کی تحقیقات شامل تھیں۔ معین الدین قریشی کے بارے میں بدر شکیب نے لکھا ہے کہ وہ اپنی علمی صلاحیتوں اور سنجیدہ مزاجی کی وجہ سے طلبا میں بے حد مقبول تھے۔۔ قریشی نے چُن چُن کر طلباء کی علمی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا اور خود گمنامی میں رہ کر ان کو بام عروج پر پہنچایا۔ یہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ جامعہ عثمانیہ کو ہمیشہ ان پر ناز رہے گا۔"

"مجلہ عثمانیہ" کے ادبی مقام کا تعین کرنا کوئی مشکل کام نہیں اس کے عام شماروں کے علاوہ خصوصی نمبروں کے مطالعہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجلہ عثمانیہ کو ہندوستان بھر کے جامعیاتی رسالوں میں صف اول کے رسائل میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ عام شماروں میں ادبی علمی اور تعلیمی مسائل پر مضامین شائع ہوا کرتے ہیں۔ اس رسالہ کے بلند معیار ہونے کی ضمانت ان ادیبوں کے نام ہیں جنھوں نے مجلہ کو اپنی نگرانی میں شائع کیا۔ وحیدالدین سلیم پہلے نگران ہیں جن کی دلچسپی اور اعلیٰ ذوقِ ادب نے اس کے پہلے ہی شمارہ کو ادبی اور تعلیمی نقطہ نظر سے معیاری بنا کر پیش کیا مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر مسعود حسین خان دنیائے ادب میں اپنی تحقیق پسند تنقید اور ادبیت کی وجہ سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان اساتذۂ اُردو کی سرپرستی میں مجلہ عثمانیہ کی اجرائی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ مجلہ عثمانیہ اُردو ادب و شاعری میں اپنا بلند مقام بنا چکا ہے۔ مجلہ عثمانیہ اب تک (۹) خصوصی نمبر پیش کر چکا ہے ان میں سے بیشتر ادبی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔

طلبائے قدیم نمبر (جلد ۶ شمارہ ۲۱ ، ۱۹۳۳ء مدیر بدر شکیب) جشنِ سیمیں نمبر (۱۹۳۷ء مدیر اشفاق حسین) مہاراجہ نمبر (۱۹۴۵ء مدیر احمد خان) حیدری نمبر (۱۹۴۲ء مدیر سید محمد) جامعہ عثمانیہ نمبر (۶۰-۵۹ مدیر ہاشم حسین سجاد) حیدرآباد نمبر (۶۵-۶۴ مدیر ابوالفیض سحر) تاریخی اور دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اور جلیل نمبر (۱۹۴۵ مدیر حسن الدین احمد) عہد جدید نمبر (۵۹-۵۸ مدیر یوسف الدین) اور دکنی نمبر (۶۴-۶۳ مدیر مصطفیٰ کمال) مقالہ نمبر (۶۷-۶۶ء مدیر زاہدہ ابوالحسن) ادبی اور تہذیبی لسانی اور تحقیقی نقطہ نظر سے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی تاریخ کو باآسانی دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جامعہ عثمانیہ جسے آصف ہفتم

بھی کہتے ہیں، ۱۹۴۸ء کے بعد کی تبدیلیوں کی وجہ سے یکسر بدل گئی اور دوسری وہ جو ۱۹۵۴ء میں جامعہ کے دستور میں بنیادی تبدیلیاں لا کر نئی شکل دی گئی اور یہی آج عثمانیہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں جامعہ کی مخصوص تہذیب پر بھی اور اس کے مزاج پر بھی اثر پڑا، قدریں بدل گئیں، روایتیں ٹوٹ گئیں اور ان تبدیلیوں کا سب سے برا اثر اردو زبان پر پڑا۔ آزادی کے فوری بعد اردو زبان اپنے ہی گھوارے سے باہر نکال دی گئی اور اس کی جگہ ایک بدیسی زبان نے لے لی۔ اب موجودہ دور میں تلگو کو رفتہ رفتہ عثمانیہ یونیورسٹی کی زبان بنایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو بھی اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ مار رہی ہے۔

جیسے ہی جامعہ عثمانیہ سے اردو زبان کی بنیادی اہمیت ختم ہو گئی، مجلہ عثمانیہ کی اہمیت بھی گھٹ گئی۔ معیار میں تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی بڑی ناخوشگوار تبدیلی ہے جامعہ کا یہ مجلہ سہ ماہی تھا سالانہ کر دیا گیا۔

ماہنامہ تجلی

کتب خانہ مسجد چوک کا ماہنامہ "تجلی" محمد سردار علی کی ادارت میں اپریل ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ پہلا شمارہ (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کے دوسرے صفحہ پر قواعد تحریر ہیں۔ اس رسالہ کا حجم کم از کم (۶۴) اور زیادہ سے زیادہ (۱۰۰) صفحے ہے۔ عام قیمت سالانہ ۲ روپیہ ششماہی ڈیڑھ روپیہ تھی۔ تجلی کے دو فائل ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہیں آخری شمارہ جلد ۳ شمارہ (۱) اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کا ہے جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مدیر سردار علی کا مقالہ ذکرِ میر یعنی سرتاج الشعراء میر تقی میر کے خود نوشت حالات کے علاوہ تمکین کاظمی کا افسانہ "مرزا صاحب"، سید محمد صاحب ایم اے کا مضمون "دکنی ادبیات انگلستان میں" اور نواب صدر یار جنگ بہادر کا مضمون تاریخ اردو پر اجمالی نظر کے علاوہ مدیر سردار علی کی تحریریں ص ۱۴ سے ص ۵۵ تک پھیلی ہوئی ہیں جن کے عنوانات ہیں کتب خانہ خواجہ حسن نظامی کے مخطوطات، بیٹر کے تاریخی کتبات، فارسی کا ایک ناخواندہ شاعر ایک علمی ہندو خاندان، شہزادہ ذوقِ خطاطی، مرزا غالب کی خود نوشت سوانح عمری، شیخ فرید الدین گنج شکر کا اردو کلام، علاء الدین شاہ بہمنی کا سنہ وفات اور نقد و نظر شامل ہیں۔ منظومات میں جوش کی نظم خاتونِ مشرق، اور بسمل کی نظم بھی

بھی شامل ہے۔

تجلی کے پہلے شمارہ میں محمد سردار علی نے شذرات لکھتے ہوئے فنکاروں کا تعارف کرایا ہے اور ان کی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں وضاحتی نوٹ لکھے ہیں اسی اداریہ میں عبدالحلیم شرر (ایڈیٹر دلگداز) شاد عظیم آبادی کے ساتھ شعبیات پر تجزیتی مواد نظر آتا ہے۔ دکنی شعرا کے ایک تذکرہ کے ترتیب کے سلسلے میں تمکین کاظمی سے تعارف کرنے کے لیے اداراتی نوٹ بھی اس شمارہ میں شامل ہے۔ سردار علی نے "عرضِ واجب" کے عنوان سے تجلی کے پہلے شمارہ میں اداریہ لکھتے ہوئے حیدرآباد کی اردو صحافت کا جائزہ لیا ہے اور رسالہ تاج، رسالہ ترقی، رسالہ لسان الملک اور "تحفہ" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ پرچے بڑی تمناؤں اور کوششوں سے نکالے گئے تھے اسکے بعد اردو صحافیوں کی دشواریوں اور نئے پرچے تجلی کی اجرا کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی ہے۔

تجلی کا معیار، نگار لکھنو کا سا تھا اور دکن کے قریب قریب صفِ اول کے سب ہی اہلِ قلم حضرات کا اسے بھرپور تعاون حاصل تھا۔ نگار کی طرح اسکے ایڈیٹر نے ہر شمارے کے لیے اپنے مضامین مختلف شماروں میں شامل کیے ہیں۔ یہی بات ہمیں "ذخیرہ" میں بھی مشترک نظر آتی ہے۔

دراصل سردار علی صاحب جو صاحبِ قلم مُدیر تھے اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ وہ ادارۂ "تحفہ" سے بھی وابستہ تھے۔ آخری ایام میں روزنامہ مُشیر دکن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ رہبرِ دکن میں بھی انہوں نے کام کیا ہے۔ عالم قابل کم سخن اور شریف النفس انسان تھے۔ تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سردار علی صاحب کا شمار حیدرآباد کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے انہوں نے "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" کے نام سے تصنیف و تحقیق کا کارنامہ چھوڑا ہے۔ احباب میں ڈاکٹر زور، تمکین کاظمی، عمر یافعی، سید محمد صاحب سروری صاحب، تراب علیخاں باز مرحوم وغیرہ شامل ہیں اور ان سب کا قلمی تعاون بھی انہیں حاصل تھا۔ اور رضی الدین کیفی کا کلام مرتب کر کے شائع کیا۔

تجلی ادبی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے حیدرآباد کا بلند معیار رسالہ تھا۔ کتب خانہ ریاست رام پور (مُدیر) فارسی ادب کے ابتدائی گہوارے (زور) منتخب التواریخ (غلام یزدانی) مظہر علی ولا (سید محمد قادری) کیفی مرحوم اور حیدرآباد (زور) جدید ہندی ادب (قاضی فصیح الدین صدیقی) میر احسن دہلوی (پروفیسر سید محمد)

غزنوی دور کا آغاز اور ایرانی علم و فضل (زور) تذکرہ میر حسن و شعرائے دکن (ایڈیٹر) چمنستانِ شعراء و شعرائے دکن (تمکین کاظمی) مثنوی تصویر جاناں (عمر یافعی) کتب خانہ شاہانِ اودھ و دکھنیات (زور) زیب النساء (عبد المنعم سعیدی) میر صاحب (فکاہیہ۔ تمکین کاظمی) اور تاریخ اردو پر اجمالی نظر (نواب صدر یار جنگ بہادر) جیسے تحقیقی اور ادبی مضامین اس رسالہ نے پیش کیے ہیں۔ اس وجہ سے تجلی کا حیدرآباد کی اردو صحافت کا بلند پایہ رسائل میں شمار ہوتا ہے۔

ماہنامہ مکتبہ

مجلہ "مکتبہ" دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی و ادبی مجلہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے اس کا حجم کم از کم چار جزو ہوا کرتا تھا قیمت سالانہ (۴) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لیے (۲-۴-۰) فی پرچہ ۶/ اور ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منتظم مجلۂ مکتبہ، مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن کے نام سے کی جاتی تھی۔ اس ادبی اور علمی رسالہ کے ایڈیٹر پروفیسر عبد القادر سروری اور شرکاء کی حیثیت سے سید محمد (صاحب) اور عمر یافعی (صاحب) کام کرتے تھے۔

"مکتبہ" اپنے دور کا معیاری اور بلند پایہ رسالہ سمجھا جاتا رہا ہے اس کے عام شمارے کے ساتھ ساتھ خاص اشاعتیں بھی نکلتی رہی ہیں۔ جن میں بلند پایہ اور مقبول ہر طرح کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اچھے افسانوں کے پڑھنے اور لکھنے کا تو مکتبہ نے گویا ایک ذوق ملک بھر میں پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اسکی خاص اشاعت بھی عمل میں آئی جس میں ملک بھر کے بلند پایہ افسانہ نگاروں نے اپنی نگارشات سے اس اشاعت کو تاریخ افسانہ نگاری میں خاص اہمیت دے دی۔

بلاشبہ "مکتبہ" کی اشاعت سے قبل حیدرآباد سے نکلنے والے ادبی اور نیم ادبی رسائل میں دیگر علمی، معلوماتی، مذہبی اور سائنسی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانے بھی شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ان افسانوں کی تکنیک کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں یا تو کہانی کا نام دیا جاسکتا ہے یا پھر طلسماتی افسانے جدید تکنیک کا لحاظ کرتے ہوئے "مکتبہ" نے جن افسانوں کو پیش کیا ہے وہ فن افسانہ نگاری کے

تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان افسانوں کے لکھنے والے آج بھی بحیثیت افسانہ نگار یا ناول نگار زندہ ہیں اور ہند گیر شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی علمی عظمت اور ادبی بزرگی مسلمہ ہے۔ "مکتبہ" نے افسانہ کی جو خدمت انجام دی ہے اس کو تاریخ افسانہ نگاری میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس خاص نمبر کے علاوہ دیگر عام شماروں میں بھی افسانہ کو خصوصی جگہ ملتی رہی ہے اور ان کے لکھنے والوں ڈاکٹر اعظم کروی ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ مولوی غلام رسول نے ہندی افسانوں کے ترجمے پیش کر کے ایک اہم خدمت انجام دی۔ مولوی صاحب موصوف نے یہ کام اس وقت کیا جبکہ لسانیاتی تعصب کی شدت نہیں پیدا ہوئی تھی۔

"مکتبہ" میں افسانوں کے علاوہ ڈرامہ اور مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور ناولیں بھی بلا اقساط چھپتی رہی ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ لسانی مسائل پر بھی ترجمہ اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ "شمالی ہند کی زبانوں میں ٹی اور ڈی کے تلفظ کی زیادتی" کے زیر عنوان گراہیم بیلی کے مضامین کا ترجمہ جولائی ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا اس مضمون کا ترجمہ پروفیسر حمید اللہ نے کیا ہے۔ ذیل میں درج کی گئی چھ شماروں کی فہرست مضامین سے اندازہ ہوگا کہ "مکتبہ" تک پہنچتے پہنچتے رسائل میں مضامین اور موضوعات کی تنومندی پیدا ہوتی تھی۔ اور ہمارے ادیب کسطرح دیگر زبانوں کے ادب اور ادب کے مزاج سے واقف ہو کر ان افکار و رجحانات کو اردو ادب میں منتقل کر رہے تھے۔ مکتبہ کو دکن و شمال کے تمام ادیبوں کا تعاون حاصل تھا چنانچہ اس کے لکھنے والوں میں محمد ذکریا، مولوی غلام رسول (صاحب) پروفیسر عبد القوی خانی لکھنؤ یونیورسٹی، عبد القادر مینائی معین الدین رہبر، ناکارہ حیدرآبادی، اصغر حسین میرٹھی، بادشاہ حسن جمیل، احمد خان کوکب، سیدہ محمد رشیدا، سید مودود احمد تشنہ، ملک سردار علی، سعادت اللہ خان ہوش، نواب محمد بہادر خان جاگیردار (بہادر یار جنگ) مولوی مظہر علی کامل وکیل، ضیا یار جنگ اور علاوہ سید اشرف شمس جیسے کہنہ مشق ادیب شامل تھے۔

ماهنامہ ہمجولی

صفی پور کی ہمہ جہتی فلاح و ترقی کا باتصویر ماہ نامہ "ہمجولی" سیدہ بیگم خویشگی کے زیرادارت جولائی ۱۹۳۱ء میں جاری ہوا۔ اس کا دیدہ زیب سرورق دو رنگوں میں شائع ہوتا تھا اور جب اس کا پہلا شمارہ ملک کے علمی طبقہ میں پہنچا تو سبھی ادیبوں اور صحیفہ نگاروں نے اس کی تعریف کی۔ ہمعصروں میں سرگزشت (علی گڑھ) حرم (لکھنو) اردو (اورنگ آباد) تاج (آگرہ) نیرنگ خیال اور ادبی دنیا (لاہور) اور سعید (دہلی) نے اس کے ظاہری حسن اور باطنی خوبیوں کو سراہا۔ چنانچہ "سرگزشت" علی گڑھ لکھتا ہے "بغداد ثانی یعنی حیدرآباد دکن سے رسالہ ہمجولی شائع ہوا ہے۔ کیا ہی دلکش نام ہے اور کیسی پیاری صورت ہے۔ صورت کے ساتھ سیرت بھی ماشاءاللہ خوب ہے۔ جو مضمون ہے اپنے رنگ میں یکتا اور نصمت کیمز و پُرکیف ہے ازحد تاج ایک گلدستہ ہے جس کا ہر پھول خوشبودار و خوش رنگ ہے۔ ٹائیٹل پیج بھی ایسا کہ جس پر یہ مصرع پورا پورا صادق آتا ہے۔

'اس سادگی پہ کون نہ گرجائے اے خدا' [۱]

واقعہ یہ ہے کہ ہمجولی النسائی کی طرح خواتینِ دکن میں شعور حیاتؔ اور ذوق ادب پیدا کرنے کے لیے جاری ہوا لیکن دو سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ۱۹۳۲ء میں بند ہوگیا۔ اس رسالہ کے کچھ چیدہ چیدہ شمارے سالار جنگ لائبریری میں اور چند شمارے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

ہمجولی کے ہمعصروں میں دہلی سے بھی ایک اور ہمجولی سعید احمد بریلوی کی ادارت میں ۱۹۳۲ء سے شائع ہونے لگا تھا چنانچہ اس کے دو شمارے جلد ۸ نمبر (۱) جولائی سنہ ۱۹۴۰ء ۔

۱۔ رسالہ ہمجولی اگست ۱۹۳۱ء

جلد ۷، نمبر (۵) مئی ۱۹۴۰ء کے شمارے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ یہ رسالہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی میں چھپوا کر شائع کیا جاتا تھا۔ لیکن حریم لکھنوی کے الفاظ میں "ہمجولی (حیدرآباد) کی وہ خصوصیت جو اس کے سوا ہندوستان کے کسی دوسرے رسالہ کو حاصل نہیں، کتابت اور طباعت ہے۔

ہمجولی ظاہری اعتبار ہی سے نہیں بلکہ معنوی لحاظ سے بھی معیاری رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ مسٹر قیصر نے "پانچ درویش موٹر میں" والا دلچسپ مضمون ہمجولی کے لئے انگریزی میں لکھا تھا جس کا ترجمہ کر کے مدیرہ نے ہمجولی کے شمارہ اگسٹ ۱۹۳۱ء میں اس کی پہلی قسط شائع کی۔ یہ طویل مضمون اپریل مئی جون وجولائی کے شمارہ میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے پہلے ہی شمارہ میں فصاحت جنگ جلیل، آزاد انصاری، عظمت اللہ بیگ، جوش ملیح آبادی، محی الدین قادری زور، علی اختر، خنجر لکھنوی، مرزا اسلیم بیگ اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی جیسے مشہور ادیب اور شعرائ کے تخلیقات شریک تھیں۔ ہمجولی کے لکھنے والوں میں دیگر ادیب صغرا ہمایوں مرزا، وزیر حسن برقی (دیلتا شہر)، سید وزیر حسن ہادی رسوا، فخرالدولہ امین الدین نفیس دلہن، ایم اسلم، عظمت اللہ بیگ اور قیسی اجمیری بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

حُسن کار نعیم ماھی

مادرِ علمیہ جامعہ عثمانیہ نے حیدرآبادی زندگی کو بہت جلد ایک نئی تہذیب اور ایک نئے سماج سے روشناس کرایا۔ نئے ذہن کی تعمیر کی اور چند نئے افراد ابھر آئے جنھیں عثمانی عہد کی تہذیب کے علم بردار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ان ہی میں سے اکبر وفاقانی بھی خاصے مشہور نوجوان تھے انھوں نے ادب کی ہر صنف میں کارنامے انجام دیئے۔ ادبی مضامین لکھے۔ ڈرامہ سوسائٹی کے رکن رہے ڈرامے لکھے اور انکی پیش کش میں حصہ لیا، کچھ مصوری بھی سیکھی جو ملک کے مشہور آرٹسٹ قیوم کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں مجلۂ عثمانیہ کے ایڈیٹر رہے اور پھر بعد کو خود اپنا ایک حسین، خوبصورت اور جاذب نظر نیم ماہی رسالہ "حُسن کار" جاری کیا جو علمی اور ادبی نقطہ نظر

سے بڑی اہمیت کا حامل تھا اکبر وفا قانی کو ادبی رجحانات اور بدلتے ہوئے معیارات سے گہری واقفیت تھی لیکن وہ فن تو صرف حسن کاری ہی کو سمجھتے ہیں چنانچہ جلد اول کے پہلے شمارہ میں لکھتے ہیں۔

حسن کاری میں ادب شاعری موسیقی آذری اور تعمیر کاری داخل ہیں اس وسعت مضامین کو ہم نے موجودہ صورت میں حسن کار کے لیے قبول کرلیا تاکہ ایک طرف حسن کاری کو اردو میں لایا جا سکے تو دوسری طرف اس کو اس قدر دلچسپ بنایا جائے کہ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں بہت سی دلکشیاں جمع کرے حسن کاری ہر قوم کی تہذیبی یادگار ہے"

چنانچہ ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے بھی حسن کار کو سنوارنے اور سجانے کی کوشش کی۔ دیدہ زیب سرورق پر پرانے پل کی تصویر جانب چارمینار کا سہ منزلہ باب الداخلہ اور ہائیکورٹ کی گنبدیں کی تصویر دی گئی ہے اور خوبصورت انداز میں اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں حسن کار لکھا گیا ہے یہ نیم ماہی ۵ر نومبر ۱۹۳۲ء سے باہتمام مقبول علی صدیقی دفتر حسن کار واقع معظم شاہی سے جاری ہوا اور دو سال تک نکلتا رہا۔ خاص مضامین کی فہرست سرورق ہی پر دی جاتی تھی۔ اس رسالہ کے لکھنے والوں میں روشن رائے سید شاہ محمد، سعید باراس، ابوالمحاسن متین صاحب حسینی سعید الحق انصاری، عبدالمجید صدیقی بدر شکیب، شنکر راؤ، غلام رسول، عبدالقیوم خان باقی اور ڈاکٹر زور شامل تھے۔

"حسن کار" خالص ادبی رسالہ تھا جس میں افسانہ، مضامین اور تنقیدوں کے علاوہ وہ ادبی مسائل پیش کیے جاتے رہے۔ صحافت اور طباعت پر اداریے اور مضامین شائع ہوئے۔ "نسوانی گفتگو" کے عنوان سے ۳ر جنوری ۱۹۳۳ء سے خواتین کے لیے جو صفحات مختص کر دیئے گئے جس کو مسز ناظرہ مرتب کرتی تھیں۔ تصاویر کے ساتھ ساتھ کارٹون کا دلچسپ طریقہ بھی شروع کیا گیا انجمن صحافت کا قیام جب عمل میں لایا گیا تو حسن کار نے اس کا خیر مقدم کیا۔ حسن کار کے عام شماروں کے علاوہ اس کے سالگرہ نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان سالگرہ نمبروں میں روایتی قصیدہ خوانی سے احتراز کیا گیا اور یہ خاص شمارے ادبی مضامین اور مسائل ہی سے پُر کیے گئے۔

حسن کار میں جن مسائلی موضوعات کو چھیڑا گیا ہے ان میں ادب اور حسن کاری کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہمارے جدید ادب کا بھی یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ وفا قانی حسن کاری کے قائل تھے

اس لیے انھوں نے "حسن کار" میں حسن کاری ہی کی وکالت کی ہے ٹالسٹائی کے نظریہ حسن کاری (روشن رائے) حسن کاری اور ہندوستانی موسیقی (عبدالقیوم خاں باقی) دانتے (باقی) اور صحافت اور حسن کاری (وفاقانی) جیسے موضوعات اس نظریہ کی غمازی کرتے ہیں۔

مستقل اداریوں میں صحافتی اور ادبی مسائل پر بحث کی جاتی تھی اور "الیوم" کے ذریعہ حیدرآباد کے لیل و نہار پیش کئے جاتے تھے۔ بحیثیت مجموعی حسن کار بمشکل تمام دو سال زندہ رہا لیکن اس نے حیدرآباد کی صحافت پر جو رنگین اور دلکش نقش چھوڑے ہیں وہ آسانی سے مٹائے نہیں جاسکتے۔ پولیس ایکشن کے بعد وفاقانی پاکستان کو ہجرت کر گئے ہیں اور وہاں وکالت کرتے رہے مولوی ابدر شکیب نے کراچی سے اطلاع دی کہ مولوی اکبر وفاقانی ایڈوکیٹ کا بہ عارضہ کینسر دوشنبہ ۲۷ مئی ۱۹۶۸ء کو انتقال ہوگیا۔

الموسی

حیدرآباد کے قدیم و جدید کالجوں میں سٹی کالج کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ پہلے اس کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے تھا آج کل محکمہ نظامت تعلیمات سے کر دیا گیا۔ اس کالج سے "الموسی" کی اجرائی سنہ ۱۹۳۳ء میں عمل میں آئی اور مرزا سرفراز علی مدیر اور یونس سلیم نائب مدیر منتخب ہوئے۔ الموسی ابتدا میں سہ ماہی رسالہ کی حیثیت سے شائع ہوا لیکن سنہ ۱۹۴۸ء سے حالات بدل جانے کی وجہ سے سالانہ کر دیا گیا۔ ابتدا میں ابوظفر عبدالواحد صاحب اور پروفیسر سید محمد صاحب اس رسالہ کے مشیر تھے۔ اس کے بعد عرصہ دراز یعنی سنہ ۱۹۵۸ء تک اکبرالدین صاحب صدیقی تنہا مشیر رہے اس رسالہ میں اساتذہ کے علاوہ طلباء کے بھی مضامین شامل ہوا کرتے تھے سرفراز علی صاحب آج کل نائب ناظم تعلیمات ہیں اور یونس سلیم پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔

الموسی اپنی اجرائی کے بعد سے آج تک برابر شائع ہو رہا ہے لیکن اب اس کا نام الموسی کے بجائے سٹی کالج میگزین ہوگیا ہے۔ الموسی کے عام شماروں کے علاوہ "ولی نمبر اور ٹیگور نمبر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ الموسی کی جلد چہارم کا یہ شمارہ سوم و چہارم ولی کا خصوصی نمبر تھا اور اس کو

سید محمد صاحب نے مرتب کیا تھا اس خصوصی نمبر میں زور، غلام طیب، مولوی عبدالحق، ابوظفر عبدالواحد عبدالقیوم خان باقی، یوسف حسین خان، شیخ چاند، عبدالمجید صدیقی، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری کے مضامین ولی کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے شریک ہیں۔ علاوہ ازیں الموسی کی جلد ۹ کے شمارہ ۱-۲ میں ٹیگور کی شاعری کے تعلق سے سید محمد صاحب، مہدی حسین صاحب اور اکبر الدین صدیقی صاحب کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

غالباً سنہ ۱۹۵۰ء سے الموسی سٹی کالج میگزین کے نام سے شائع ہونے لگا ہے اس میں زیادہ تر طلبا ہی کی نگارشات اور کاوشوں کو جگہ دی جا رہی ہے۔ اس رسالہ میں ادبی اور علمی و تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اس وجہ سے حیدرآباد کی درسگاہوں سے شائع ہونے والے رسائل میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ آج بھی ہر سال پابندی سے شائع ہوتا ہے۔

سہ ماہی مجلہ طیلسانین

مجلہ "طیلسانین" جامعہ عثمانیہ کے فیوض و برکات میں سے ایک اہم برکت بن کر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء سے جاری ہوا اور اپنی ۱۲ جلدیں پوری کر کے ۱۹۴۹ء میں نامساعد حالات کا شکار ہو گیا یہ رسالہ معنوی اور ظاہری طور پر خوبصورت اور مفید تھا۔ اس رسالہ کی اہم خوبی یہ رہی ہے کہ ایم۔ اے کے لیے لکھے گئے مقالے اس میں شائع ہوا کرتے تھے۔ اور اس میں طیلسانین جامعہ عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین اور مقالات بھی بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ رسالہ کی صفحات کم از کم ۱۲۵ صفحے ہوا کرتے تھے اور ہر سال کے ماہ جنوری اپریل جولائی اور اکٹوبر میں شائع ہوتا رہا چونکہ مجلس علمیہ کی طرف جاری کردہ سہ ماہی تھا اس وجہ سے پابندی سے شائع ہوتا رہا پہلے جو مجلس ادارت تشکیل پائی ہے ان میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر غلام رشید، مہندر راج سکسینہ اور پروفیسر سید محمد شریک تھے۔ جب یہ رسالہ اپنی چھ بہاریں پوری کر چکا اور ساتویں بہار میں قدم رکھا تو اس وقت محمد غوث صاحب بحیثیت مدیر اس سے منسلک ہو گئے اور نویں بہار میں قدم رکھتے رکھتے مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب اور مولوی نور اللہ صاحب بھی شریک مدیر کی حیثیت سے اس مجلہ

سے وابستہ ہو گئے بعد کو مولوی اکبرالدین صدیقی صاحب کی وابستگی آخر تک برقرار رہی اور جلد (۱۱) کے شمارہ ۱ و ۲ میں ان ہی کو ایڈیٹر بنایا گیا۔

مجلہ طیلسانئین کی ادارت میں یہ تبدیلیاں خوش آئند ثابت ہوتی رہیں۔ معیار میں اضافہ ہوتا رہا اور مزید خصوصیت یہ رہی ہے کہ ابتدائی کے سات سال بعد "معاشیات" کے لیے اس رسالہ کے بڑا حصہ مختص کر دیا گیا۔

اس مجلہ کو طلبا اور اساتذہ کا یکساں طور پر تعاون حاصل تھا چونکہ مجلس علمیہ کا ترجمان بھی تھا اس وجہ سے اس مجلس کی مکمل روئیداد اس میں شائع ہوا کرتی تھی۔ مقالوں کے علاوہ ادبی سیاسی اور تاریخی موضوعات پر مضامین، نئی کتابوں پر تبصرے اور افسانے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔

ماہنامہ تعلیم

عبدالرحمن رئیس اپنے اخبار وقت اور منشور کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ ان کے سیاسی مسلک کی وجہ سے بھی حیدرآباد کے صحافیوں میں خاص مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو تعلیم جاری کیا۔ دراصل یہ کوئی انفرادی ماہ نامہ نہیں بلکہ روزنامہ "وقت" کا ضمیمہ تھا لیکن اس ضمیمہ کی بڑی ادبی اہمیت بھی تھی۔ جب یہ ضمیمہ جاری ہوا تو اس کے پہلے شمارہ میں نواب مہدی یار جنگ کا پیام بھی شامل تھا۔ اس پیام میں انہوں نے کہا تھا۔

"...... اس کو منشور یا وقت کی نہ خوشی قسمتی کہئیے یا بدقسمتی کہ وہ کبھی بھی کسی کا آلۂ کار نہیں بنا اور ہمیشہ اپنے ایقان اور ایمان کا پابند رہا۔ اسی آزاد مشرب نے ہمیشہ اس کو کشمکش حیات میں مبتلا رکھا اور اگر خدا نے چاہا تو یہ ضمیمہ بھی اسی روایت کا پابند رہے گا۔"

اس شمارے کے لکھنے والوں میں سجاد مرزا، جلال الدین اشک، مرغوب الدین، بلقیس، سید علی اکبر، عبدالقیوم باقی، لطیف الدین، سید محمد، سید مہدی حسن، ڈاکٹر ذاکر حسین، طفیل احمد اور بدرگاہ سنگھ قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں جلال الدین اشک، نوراللہ نوری، میکش اور باقی۔

تعلیم میں بچوں کا صفحہ بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ اور اس ضمیمہ میں فلمی تبصرے بھی ہوا کرتے تھے عبدالرحمن رئیس کا ایک اور منفرد کارنامہ بھی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کی قیمت صرف ایک پیسہ رکھی تھی۔ اس زمانہ میں اس طرح کے اخبار پورے ہندوستان بھر میں دو ایک ہی تھے مثلاً لاہور کا پیسہ اخبار جسے حافظ محمد عالم شائع کرتے تھے اور دوسرا انتخاب لاجواب جو ہفتہ وار تھا۔ اس طرح رئیس نے اخبار بینی کے ذوق کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دو صفحہ ہی کا اخبار ہوا کرتا تھا۔ اس طرح کا اخبار بعد میں احمد اللہ قادری نے پیسہ اخبار کے نام سے جاری کیا تھا۔

وقت اور منشور کے بند ہوتے ہی 'تعلیم' بھی بند ہو گیا۔

ماہنامہ سب رس

مشہور محقق و ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خان (صاحب) نے "یوم زور" (۱۹۶۶ء) میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کو اردو زبان و ادب کا قائد قرار دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے یوں ہی نہیں کہی ہے وہ خود بھی اردو ادب میں ماہر لسانیات، نقاد، اور محقق کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ آج حیدرآباد میں ان کی شخصیت دائرہ ادب کا مرکز بن گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہمعصر کے خدمات کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے ایک تو یہ بات خود ان کی حق گوئی صداقت پسندی اور وسیع النظری پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر زور کے عظیم کارناموں اور گراں قدر خدمات کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نے ہمہ گیر خطوط پر اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دیئے ہیں اس کی مثال تاریخ ادب میں ملنا مشکل ہے۔ وہ ایک ذات تھے لیکن اپنی ذات میں انجمن بھی! ان کی شخصیت کو صرف دکن تک محدود کرنا ان کے خدمات کے کھلے اعتراف سے جی چرانا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام پورے ہندوستان کے اردو بولنے والوں کے لیے یکساں مفید اور کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ "ایوان اردو" کی تعمیر سے ان کے عزم مصمم، بلند حوصلگی اور اردو زبان سے والہانہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ایوان اردو، اردو زبان کے نامساعد حالات میں مینارۂ نور بن کر تابناکی دیکھا رہا ہے۔ ادارہ کا عظیم

گشتہ خانہ تشنہ لبان ادب کی سیرابی کے لیے چشمۂ حیوان کی اہمیت رکھتا ہے۔ آزاد اور نیشنل ریسرچ انسٹیوٹ نے تحقیق و تدقیق کا نیا باب کھول دیا ہے۔ ان ہی عظیم کارناموں میں سب رس کی اجرائی بھی ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں تنقید و ادب کی تاریخ میں اور اردو تحقیق کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی تاریخ میں ڈاکٹر زور کی شخصیت ہما کے سایہ کی طرح سایہ فگن ہے۔ چنانچہ زور مرحوم نے ادارۂ ادبیات کے قیام کے بعد ۱۹۳۸ء میں ماہ نامہ "سب رس" کو جاری کیا۔ یہ ان کے جذبۂ خدمت، اخلاص اور عزمِ مستحکم کا نتیجہ ہے کہ ۳۰ سال گذر رہنے کے باوجود آج بھی "سب رس" معجزانہ طور پر صرف زندہ ہی نہیں بلکہ اسی آب و تاب کے ساتھ اردو کی گراں قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر زور کے دیگر کارناموں میں میرے نزدیک ان کا سب سے اہم کارنامہ افراد کی تعمیر ہے۔ انہوں نے اپنے اطراف محبانِ اردو کو جمع کیا ان کے ساتھ کام کیا اور ان میں کام کرنے کی لگن پیدا کر دی۔ وہ بڑے ادیب تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ادیب بنا دیا وہ مورخِ ادب تھے ان کے ساتھی تحقیق کے کام میں جٹ گئے، وہ مخلص کارکن تھے ان کے ساتھیوں نے اس اخلاص سے کام کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا وہ ان ہی کارناموں کی وجہ سے ادیب گر کہلاتے ہیں آج ان کے ساتھی بھی ادیب گر بن گئے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں سب رس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کے نگران اور صاحبزادہ میکش مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ میکش کے بعد حمید الدین شاہد، سلیمان اریب اور وقار خلیل بھی مختصر عرصہ کے لیے ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں حمید الدین شاہد ہی اپنے استاد و محسن کے مقرب رہے ہیں ان کا ذوقِ ادب ڈاکٹر زور ہی کی تربیت کا رہینِ منت ہے۔ سلیمان اریب، ڈاکٹر زور کی شفقت اور ان کی محبت کو مانتے ہیں، کہتے ہیں "وہ ہمیشہ مجھ سے محبت سے پیش آتے رہے" ادیب کی صحافتی زندگی کا آغاز بھی درحقیقت "سب رس" ہی سے ہوتا ہے۔ وقار خلیل کو سب رس سے وابستگی پرانا ہے۔ لیکن یہ لوگ ڈاکٹر زور کی موجودگی میں سب رس کا کام کرتے رہے۔

سب رس کے مجلس مشاورت اور ادارت سے ممتاز عثمانین میر حسن، جناب غلام جیلانی بھی وابستہ رہے ان دنوں ڈاکٹر مغنی تبسم وابستہ ہیں۔

علمی اور ادبی نقطہ نظر سے سب رس کی اشاعت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ تحقیق کے میدان

میں "سب رس" مخبر کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہ "باب الداخلہ" ہے جہاں سے ہر ادیب اور محقق کو ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ "سب رس" ہمیشہ سے موقتی تحریکوں سے محفوظ رہا ہے لیکن ہر نئے رجحان کو اس میں جگہ ملی ہے۔ اس رسالہ کی اگر خصوصیت ہے بھی تو یہی کہ اس کے صفحات دکنی ادب کی بازیافت کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ دکنی ادب کی بازیافت، ایک تہذیب اور ایک کلچر کی دریافت ہے۔

"سب رس" کے ذریعہ ادب کے جن کھنڈرات کو کھود اجا رہا ہے اس کا مقصد ریت کے میدانوں میں ہل چلانا نہیں "ایلورہ اور اجنتہ" کی دریافت کرنا ہے۔ میرے خیال میں قدیم ادب جدید ادب سے کہیں زیادہ بہتر اور صحت مند ہے چاہے لسانی اعتبار سے کتنا ہی قدیم سہی ظاہر ہے ایسے ادب کی بازیافت میں ماہ نامہ "سب رس" نے اپنے صفحات کو واقف کیا ہے تو یہ کارنامہ عظیم بھی ہے اور منفرد بھی۔ سب رس کی یہی خصوصیت ہند و پاک کے تمام رسائل میں اس کو ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

سب رس حیدرآباد کے ادبی رسائل ہی میں نہیں بلکہ ہند و پاک کے سارے رسائل میں معمر رسالہ ہے اب تک اس کے خاص نمبروں کی تعداد انتیس ۲۹ ہو چکی ہے یہ تعداد ان ادارہ نمبروں سے الگ ہے جو ہر سال سب رس نے شائع کئے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ سب رس کا مطالعہ محققوں، ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور طالب علموں کے لیے بے حد ضروری بن گیا ہے بلکہ ہم طالب علموں کے لیے تو یہ رسالہ کورس میں داخل سمجھئے۔ یہ انفرادیت صرف "سب رس" کی ہے کسی دوسرے رسالہ کی نہیں۔

ہندوستانی ادب

"ہندوستانی ادب" حیدرآباد کے قدیم ترین رسائل میں سے تھا۔ جس طرح روزنامہ مشیر دکن سنہ ۱۸۹۲ء اور رسالہ سب رس سنہ ۱۹۳۸ء سے مسلسل جاری ہیں اسی طرح ماہ نامہ "ہندوستانی ادب" سنہ ۱۹۷۸ء تک جاری رہا اور ادب کی اپنی سی خدمت انجام دیتا رہا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ماہ نامہ سب رس نے اپنے بہتر معیار کی وجہ سے آج بھی ملک بھر میں اپنا وقار بنائے رکھا ہے لیکن روزنامہ مشیر دکن اور ہندوستانی ادب کم تر درجہ کے جرائد سمجھے جاتے ہیں۔ آج ان کی اہمیت محض ان کی قدامت کی وجہ سے باقی ہے۔ روز اول ہی سے مولوی غلام محمد خان (جی۔ یم۔ خان) اس ماہ نامہ کے ایڈیٹر تھے

مولوی غلام محمد خان جامعہ عثمانیہ کے قابل فرزند تھے۔ اپنے دور طالب علمی میں ذہانت اور صلاحیت کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں جب انجمن اتحاد طلبا کے انتخابات ہوئے تو انہیں مخدوم محی الدین کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں وہ ۱۹۳۴ء کے مجلہ عثمانیہ کے مخدوم محی الدین کے اشتراک کے ساتھ مدیر بھی منتخب ہوئے تھے۔ جامعہ سے نکلنے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی ادب کے نام سے ماہ نامہ جاری کیا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں اعلیٰ معیار کی وجہ سے خاص اہمیت و شہرت رکھتا تھا لیکن ان دنوں اس کی اہمیت ایک کم تر ڈائجسٹ کی سی ہو کر رہ گئی تھی مضامین دیگر رسائل وجرائد سے نقل ہوتے تھے نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی اس میں شامل رہتا تھا۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بھی ناقص استعمال ہوتا ہے اور اردو الفاظ کا صوتی بنیاد پر املا لکھا جاتا ہے گویہ تحریک اب دم توڑ چکی ہے لیکن رسائل میں ہندوستانی ادب حیدرآباد اور گگن (بمبئی) دو ہی ایسے رسائل ہیں جو اس اصول پر کاربند ہیں اور افراد میں ڈاکٹر جافر ہسن (جعفر حسن) اسی اصول پر عمل پیرا ہیں۔

کسی زمانہ میں ہندوستانی ادب کے دو خاص نمبر جو ٹیگور اور جلیل کی شعری خدمات کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے شائع ہوئے تھے بے حد مقبول ہوئے۔ جی ایم خان کا ۱۹۷۸ء میں انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے یہ قدیم رسالہ بند ہوگیا۔

سہ ماہی سیاست

علوم سیاسی و اجتماعی کا یہ سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکٹوبر کی پہلی تاریخوں کو شائع ہوا کرتا تھا۔ اس رسالہ کی اجرائی کا مقصد سیاسی اور اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقہ میں مقبول بنانا اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہو اسے اردو میں منتقل کرنا تھا۔ یہ ایک خالص علمی رسالہ تھا جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع

ہوتے تھے۔ اسی بے لاگ خدمات کی وجہ سے "سیاست" کو علمی و ادبی حلقوں میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اُردو ادب کے سرمایہ میں "سیاست" نے جو گراں قدر اور بیش قیمت بالشان سرمایہ کا اضافہ کیا ہے اور جس نایاب زبانوں کے نکہ انگیز ادبی سرمایہ کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے اُردو کی صحافتی تاریخ میں اس رسالہ کے مرتبہ بلند کرنے کے لیے کافی ہے۔

رسالہ سیاست کی ابتداء کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب لکھتے ہیں کئی سال ہوئے برادر محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے ایک سہ ماہی رسالہ نکالنے کے متعلق فرمایا تھا جس میں سیاسی اور اجتماعی زندگی کے مسائل پر اعلیٰ علمی معیار سے بحث ہو، میں نے اس خیال کی تائید کی۔۔۔ اس دفعہ گرمیوں میں جب ذاکر حسین تشریف لائے اور تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا تو اس دوران میں اس رسالہ کا پھر ذکر نکلا۔ بہت کچھ غور و گفتگو کے بعد رسالہ کے مقاصد اور اس موضوع کا ایک ذہنی خاکہ تیار ہو گیا۔ حیدرآباد کے پرسکون اور علمی فضا میں تمام جھگڑوں بکھیڑوں سے الگ شاید کام اچھی طرح ہو سکے عثمانیہ یونیورسٹی کی بدولت یہاں اہلِ قلم کی ایسی جماعت موجود ہے جو اُردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم و تدریس میں معروف ہے۔ اُردو میں علوم تمدن کا رسالہ نکالنے کے یہاں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی چنانچہ رسالہ نکالنے کی ذمہ داری میں نے اپنے اوپر لے لی اور جنوری ۱۹۴۰ء میں پہلا نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے[۱]

حیدرآباد کی اس پرسکون اور علمی فضائیں جوں ہی یہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اُردو داں طبقہ میں پیش کرنے والا رسالہ پہنچا بے حد مقبول ہوا اس رسالہ میں ملک بھر یونیورسٹیوں کے اسکالرز، پروفیسرز اور طلباء کے بھی بیشتر مضامین اور تحقیقی مقالے شائع ہونے لگے تھے۔ خصوصاً سماجی اور اجتماعی علوم میں مغربی زبانوں کے سرمایہ کو ترجموں کے ذریعہ اُردو میں منتقل کیا جانے لگا۔ یہ رسالہ افادی اعتبار سے خصوصی نوعیت کا حامل تھا۔ اور اگر آپ سماجی معاشی اور اخلاقی مسائل کو ادب سے الگ نہیں سمجھتے ہوں تو اس رسالہ نے زبان و بیان کے جو نقش چھوڑے ہیں ان کے پیش نظر خالص ادبی رسالہ تسلیم کرنے میں قباحت محسوس نہیں کریں گے

---

[۱] سیاست جلد اول شمارہ ۱ ص ۳

اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر حمید اللہ، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر جعفر حسن، ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر انور اقبال قریشی نور الحسن، دہاج الدین شمیم، عبد اللطیف، جمیل الرحمن پروفیسر محمد مجیب، عزیز احمد سبزواری، ملک سردار علی خان، عبد الغفور فاروقی، سید احمد کبیر، خلیفہ عبد الحکیم، امتیاز حسین خان، ناصر علی اور ہمنت رائو قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر عبد القادر مرحوم مجلسِ ادارت سے وابستہ تھے جب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے اور وہ بعد کو علیگڈھ گئے تو "سیاست" کی اجرائی بھی موقوف ہوگئی۔

جریدہ صحتِ عامہ

حیدرآباد میں اردو صحافت ان معنوں میں بھی ممت مند اقدار کی حامل رہی ہے کہ اس کا آغاز رسالہ طبابت سے ہوا تھا۔ رسالہ طبابت کی اشاعت کے بعد بھی طبی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا ہے جن طبی رسائل نے حیدرآبادی صحافت کو صحت مندی اور توانائی عطا کی ہے ان میں "جریدہ صحت عامہ" نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ جریدہ صحت عامہ پہلی بار ۱۹۴۱ء میں حکیم لیق احمد نعمانی کی ادارت میں حیدرآباد سے جاری ہوا۔

حکیم لیق احمد نعمانی ابن حضرت شاہ رفیق احمد نعمانی وکیل حیدرآباد کے شریف و معزز گھرانے سے وابستہ ہیں جن کا ددھیالی سلسلہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمانی ابن ثابت تک اور ننھیالی سلسلہ حضرت خواجہ دکن سید نابندہ نواز گیسودراز تک پہنچتا ہے۔

حیدرآباد کے آخری مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد (پہلے صدر اعظم باب حکومت) سے ممتاز اطبأ کے ساتھ ملاقات کی اور ایک یادداشت کی کہ مدرسہ طبیہ یونانی جو سالہا سال سے سینکڑوں اطبأ پیدا کیا اس مدرسہ کو ترقی دے کر اس کا احیاء کیا جائے کہ یہ یا کالج کا درجہ دیا جائے اور جامعہ عثمانیہ سے اس کا الحاق کیا جائے چند اور تعمیری تجاویز بھی پیش کیے جس پر مہاراجہ بہادر نے قدر افزائی فرماتے ہوئے فوری کارروائی کرنے کے لیے ارباب متعلقہ کو حکم دیا۔ نصاب جدید مرتب کرنے

ہندوستان کے مشاہیر اطبائ کو حکومت نے مدعو کیا ان کے استقبال، ان کے استقبالیہ جلسہ کی معتمدی کے فرائض لیق صاحب ہی کے سپرد رہے۔

انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی ایک ماتحت انجمن عثمانیہ بلدی جماعت کی دوسری سالانہ کانفرنس عظیم الشان پیمانہ پر ستمبر ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوئی اس میں لیق صاحب نے طب یونانی پر ایک مبسوط مقالہ سنایا۔ آخر میں چند تعمیری تجاویز بنیادی تحریکات بھی پیش کیں حیدرآباد کے سارے ممتاز اخبارات نے اس مقالہ کو شائع موقر روزناموں رہبر دکن، پیام، صبح دکن نے اداریہ بھی لکھ کر حکومت کو بطور خاص توجہ دلائی چنانچہ رہبر دکن نے لیق صاحب کی تجاویز کو درج کرتے ہوئے ارباب اقتدار کو مشورہ دیا کہ "پوری تن دہی سے اس مقصد کے حصول کے لیے کام کریں"۔

کل حیدرآباد انجمن اطبائ یونانی کی سرپرستی میں عظیم الشان تاریخی کانفرنس طبی کے نمائش کیساتھ منعقد ہوئی۔ جسمیں قائد اعظم محمد علی جناح بھی شریک رہے اس کانفرنس کے شریک معتمد اور نشر و اشاعت کے معتمد کی حیثیت سے لیق صاحب نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ آخری اجلاس میں صدر اعظم حیدرآباد یمین السلطنت سر مہاراجہ بہادر نے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد کے ممتاز خدمتگار دس اطبا کرام اس اعتراف کے ساتھ سند اور نقروی تمغہ عطا کیے۔

جن اطبائ کرام نے حصہ ان کے نام یہ ہیں۔ حکیم نواب مقصود جنگ بہادر، علامہ حکیم محمد کبیر الدین مولانا حکیم محمد اعظم صدیقی، علامہ حکیم سید حیدر حسینی، حکیم عبدالقادر سعفا مجددی، مولانا حکیم ابوالخیر میر محمد طیب شاہی، حکیم احمد اکرم الدین طبیب ہاشمی، حکیم محمد صبغتہ اللہ پروفیسر، حکیم ظفرالدین ناصر ایڈیٹر طبی حکیم دکن حکیم لیق احمد وغیرہ

۱۳۵۰ف م ۱۹۴۰ء میں صحت عامہ کے نام سے ایک پندرہ روزہ جریدہ حکیم لیق احمد نعمانی نے جاری کیا جو کامل دس سال تک ملک اور داخل ملک نیز حکومتی سرگرمیوں کے بے غرض افادت رساں خدمت کرتا رہا۔ یہ جریدہ طبی خدمت انجام دینے کے علاوہ عوام خصوصاً نوخیز نسل میں صحت و مسرت کے اصول کو پھیلاتا اور حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے جیسے زریں مقولہ پر عمل کرنے کی طلبائ اور عوام کو ترغیب دلاتا رہا حکومت حیدرآباد کے سررشتہ جات طبابت، تعلیمات، صحت عامہ کے علاوہ طبی قومی اداروں

کا تعمیری سرگرمیوں کو نمایاں طریقہ پیر ملک کے سامنے پیش کرتا رہا۔ جریدہ صحت عامہ نے لیق صاحب کی کوششوں سے دس سال کے عرصہ میں متعدد خصوصی اشاعتیں منظر عام پر پیش کیں سالناموں کے علاوہ اطفال نمبر، اے آر پی نمبر، خواتین نمبر، مدافعت نمبر، ڈاکٹر لطیف سعید نمبر، امن عامہ نمبر، جنسیات نمبر، فزیکل نمبر، بہبودیٔ اطفال نمبر، ضلع کانفرنس نمبر، نشریات (محنت) نمبر، رضاکارانہ تنظیمی ادارہ جات نمبر، مہاتما گاندھی نمبر جیسے تعمیری صحت نواز خصوصی نمبروں نے ملک سے خراج تحسین حاصل کیا۔ تقریباً دس سال جریدہ صحت عامہ کامیابی کیساتھ جاری رہا۔ ارباب اقتدار ارباب صحافت اور قومی رہنماؤں نے زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی۔

جریدہ صحت عامہ کی اشاعت کے دوران چند اور پرچے ملک میں شائع ہوا کرتے تھے ان کی ترتیب اور تبویب بھی لیق صاحب کے ذمہ تھی۔ نظام آباد کے ہفتہ وار ترجمان اضلاع، رائے عامہ خلیق، حکیم دکن کی بھی لیق صاحب نے قلمی اعانت کی۔ دکن نیوز سرویس کی ادارت کے فرائض بھی لیق صاحب نے سال ڈیڑھ سال تک انجام دیتے رہے جبکہ سر اکبر حیدری حکومت نے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کی زباں بندی اور مرزا امام بیگ صاحب رونق قادری ایڈیٹر دکن نیوز کی قلم بندی کردی تھی

نواب مہدی نواز جنگ جب حکومت حیدرآباد کے وزیر طبابت مقرر ہوئے ان کے ایما پر جریدۂ صحت عامہ کو بند کر کے حکیم لیق احمد نے ملازمت قبول کرلی۔ یونانی صدر شفاخانہ چار مینار پر چند ماہ کارگذار رہ کر گلبرگہ شریف کے دواخانہ یونانی درجہ اول پر لیق فائز ہوئے۔

گلبرگہ کے دواخانہ کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے لیق صاحب نے ابو القلم بندہ نوازی کے نام سے ماہنامہ شہباز (آستانہ بندہ نواز) کا ادارتی پورا کام انجام دیتے رہے۔ حضرت سجادہ نشین صاحب سیدنا بندہ نوازؒ نے اس ماہنامہ شہباز کی اس قدر مالی امداد اور سرپرستی فرمائی کہ شہباز مہینوں جاری رہا شہباز کی خصوصی اشاعتوں بندہ نواز نمبر (ہر دو) رحمۃ للعالمین نمبر، محبوب سبحانی نمبر، غریب نواز نمبر اہم ہیں

گلبرگہ سے لیق صاحب کا تبادلہ کوگی پر ہونے کے بعد چند ماہ شہباز جاری رہ کر مسدود ہوگیا۔

بیس سالہ طبیب سرکاری کی حیثیت سے فائز رہ کر سنہ ۱۹۷۲ء میں گلبرگہ شریف ہی کے دواخانہ یونانی

سے ذلیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۷۵ء میں حیدرآباد واپس ہوئے۔ اس طرح ۷ جون ۱۹۷۸ء سے جریدہ کا دوسرا دور شروع ہوا۔

بچوں کی دُنیا

تاریخ اردو صحافت حیدرآباد میں ابتدا ہی سے بچوں کے ادب کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ جہاں تعلیمی، اصلاحی اور علمی تحریکیں مختلف رسائل وجرائد کے ذریعہ پرورش پاتی رہیں وہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان ہی رسائل وجرائد کو استعمال میں لایا گیا۔ ویسے تو ۱۸۵۹ء میں حیدرآباد سے سب سے پہلی مرتبہ طبی رسالہ جاری ہوا لیکن نصف صدی کے بعد ۱۹۰۸ء میں بچوں کے لیے بھی ایک ماہنامہ جاری ہوا جو اپنے وقت کا مقبول عام رسالہ تھا مولوی عبدالرب کوکب کے سر بچوں کا رسالہ جاری کرنے کا سہرا باندھا جاتا ہے جنھوں نے "اتالیق" جاری کیا تھا۔ "اتالیق" اصلاحی رسالہ تھا اور اپنے انداز کا واحد رسالہ تھا اس لیے حیدرآبادی حلقوں خصوصاً بچوں میں جلد ہی مقبول ہوا۔ عرصہ دراز تک میزان کی وجہ سے بہت سے اخباروں نے بھی بچوں کا صفحہ شائع کرنا شروع کیا تھا لیکن آج کل سوائے رہنمائے دکن کے کسی بھی اخبار میں بچوں کا صفحہ شامل نہیں ہے۔ آج جب کہ نئی نسل اُردو زبان سے کوری ہوتی جارہی ہے بچوں کے لیے رسائل کی اجرائی بے حد ضروری ہے۔ ان رسائل کی وجہ سے نہ صرف ادبی ذوق بچوں میں پیدا ہوگا بلکہ اُردو زبان بھی بچوں میں عام ہوتی رہے گی۔

بچوں کی دنیا اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جو ہر ساتویں روز شائع ہوا کرتا تھا اور ایک باتصویر رسالہ تھا چوں کہ اس رسالہ کو بچوں کی ایک کثیر تعداد پسند کرتی تھی اور ان کا تعاونِ عمل بھی حاصل تھا اس لیے بہت جلد مشہور و ممتاز بھی ہوا۔ "بچوں کی دنیا" جاری کر کے اظہر افسر نے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی تھی۔

اظہر افسر کا تعلق اُردو صحافت سے میزان ہی کے زمانہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ میزان پہلا روزنامہ تھا جس نے بچوں کی لیگ کی بنیاد ڈالی اور اس کا سہرا میزان کے مالک مولوی غلام محمد کلکتہ والا کے سر جاتا ہے جنھیں بچوں کے ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور جو بچوں کو بے حد پیار کرتے

تھے۔ میزان لیگ کا قیام اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی جس کے باضابطہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ اس کی اضلاعی شاخیں بھی سرگرم عمل رہیں۔ ان انجمنوں کے جلسوں کی رپورٹیں بچوں کے صفحہ پر شائع ہوتیں۔ میزان لیگ کے ممبروں کی تعداد ہزاروں میں تھی اور اس کے لکھنے والوں میں آج کے بہت سے مشہور افسانہ نگار اور ادیب شامل تھے اسی بچوں کے صفحہ کے ترتیب کار اظہر افسر تھے۔ پولیس کارروائی کے بعد جب میزان بند ہوگیا اس کے بعد اظہر افسر نے ۹ مئی ۱۹۴۹ء میں "بچوں کی دنیا" (سہ ماہی رسالہ) جاری کیا اور اس رسالہ کو بچوں کی لیگ کے تمام ممبروں کا تعارف حاصل ہو گیا۔ بچوں کی لیگ کی شاخیں ریاست مرحومہ کے تقریباً سولہ ضلعوں میں تھیں اسی وجہ سے یہ رسالہ بہت دور دراز تک پہنچ گیا۔ "بچوں کی دنیا" کی ترویج اشاعت میں خود ایڈیٹر رسالہ اظہر افسر کی صلاحیتوں کا بھی دخل تھا۔

اظہر افسر نے "بچوں کی دُنیا" کے معیار کو بلند کرنے اور اس کو ایک مقبول عام رسالہ بنانے کیلئے مختلف جدتیں کی تھیں۔ مثلاً بچوں میں مطالعہ کا ذوق عام کرنے کے لیے دلچسپ کہانیوں اور نظموں کے علاوہ لطیفے اور کارٹون کو بھی جگہ دی۔ بچوں کی دنیا کو مختلف رنگوں میں شائع کیا جانے لگا اور بچوں کی آسانی کے لیے کتابت بھی خوب صورت اور بڑی بڑی کروائی گئی۔ بچے ذوق و شوق سے اور بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔

بچوں کی دنیا کے لکھنے والوں میں مصلح الدین احمد، حمید الدین محمود، افتخار احمد اقبال، وحیدہ نسیم، عفت موہانی، محمود انصاری، مختار خلیل، شمیم انصاری، صبیحہ تسنیم رزاقی، سلیمہ خاتون اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید شامل تھے۔ افسوس کہ یہ منفرد اور معیاری رسالہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

عطارد

ماہنامہ عطارد کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں عابد انصاری کی ادارت میں شائع ہوا۔ چھ مہینے ماہنامہ رہا اور پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں بند ہو گیا۔ اس رسالہ کی عمر صرف ایک سال رہی لیکن اپنے بلند پایہ مضامین اور شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں ممتاز مقام

رکھتا تھا۔ یہ ایک علمی ادبی اور اخلاقی ماہنامہ تھا اور ہفتہ وار بن جانے کے بعد بھی چیز تبصروں سے قطع نظر زیادہ تر علمی وادبی ہی رہا۔ اس کے اداریہ کا مستقل عنوان جام جم تھا۔

عطارد میں مضامین لکھنے والے سید فضل الرحمٰن (علیگ) نثار صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، بادشاہ حسین، ابراہیم جلیس، زینت ساجدہ اور مغنی تبسم تھے۔ عنوانات حسن اور انقلاب، معاشرہ کے محرکات، اسلام اور سوشلزم، مسیر فردوس، حیدرآبادی فرجی کی داستان جنگ، خواب اور اس کی حقیقت پردہ کی ضرورت وغیرہ نمایندہ موضوع بحث بنتے رہے۔ عطارد کا شعری حصہ بھی بڑا ہی جاندار ہوتا تھا اور اس زمانہ کے مشہور شعرا کا کلام اس میں شائع ہوا کرتا تھا۔ شاعروں میں حضرت امجد حیدرآبادی، منتھی اورنگ آبادی، نظر حیدرآبادی، حضرت علی اختر، حضرت ماہر القادری، حضرت سلیمان خطیب، تحسین سروری، خیرات ندیم وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان خطیب بھی عطارد سے وابستہ تھے۔

عطارد ایک معیاری ماہنامہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ابھی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلی کے نتیجہ میں بند ہو گیا۔

ماہنامہ ایوان

مختار کرمانی صاحب مولوی منظور احمد صاحب ٹیکچرر اورنگ آباد کالج کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ تعلیم سے زیادہ رغبت نہیں تھی مڈل اسکول سے ہی تعلیمی سلسلہ ترک کر کے معظم جاہی مارکٹ کے روبرو طویلہ سفرخان کی ایک گلی میں پان کی دکان قائم کرلی جو ہندوستانی شاپ کے نام سے بیحد مقبول اور مشہور ہوئی اسی کے ساتھ سہ روزہ مدینہ بجنور کی ایجنسی بھی لے لی اور مقامی اخبارات اور بیرونی رسائل بھی دوکان پر رکھنے لگے۔ کرمانی صاحب نمک لاجواب اور شاہی بیڑے کے موجد ہیں۔ اور اتفاق سے دونوں چیزیں بہت مشہور ہوئیں۔ آج بھی ان کے بھانجے جو آنکھوں سے معذور ہیں اس نمک لاجواب کو فروخت کرتے ہیں۔ شاہی بیڑا اس قدر لطیف، لذیذ اور خوشبودار ہوتا تھا کہ بقول احمد کی منہ مہک جاتا تھا۔ اور دور دور تک اس کی خوشبو پھیلتی تھی۔ جس زمانہ میں

دو پیسے حالی میں پان کا بیڑا فروخت ہوتا تھا مختار صاحب اس شاہی بیڑے کو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوتا تھا آٹھ پیسے حالی میں فروخت کرتے تھے اس دور کے بڑے بڑے امرا اور وزرا کے یہاں سے روزانہ سینکڑوں بیڑوں کی فرمائش آتی تھی۔ یہی بیڑا احمد مکی صاحب اور مختار صاحب کی دوستی اور رفاقت کا موجب بنا۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں صحافت کی "وبا" پھوٹ پڑی تھی متعدد جرائد جاری ہوئے اسی وبا کا شکار مختار کرمانی صاحب بھی ہو گئے اور انہوں نے "ایوان" جاری کر دیا۔ ابتدائی پرچے بالکل قدامت پسندی کے حامل تھے۔ بعد میں علامہ حیرت بدایونی جیلانی بیگم اور رشید احمد صاحب اس کے ادارہ تحریر میں شریک ہو گئے تو پرچے میں کسی قدر تبدیلی ہو گئی۔ پولیس ایکشن سے پہلے ایوان کا پہلا سالنامہ شائع ہوا تھا جس کی ترتیب میں بڑی خوش سلیقگی برتی گئی تھی اور سرورق بھی دیدہ زیب تھا۔ یہ سالنامہ کافی ضخیم اور معیاری تھا اور نامور ادیبوں اور شعرا کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ادیبوں کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد مختار صاحب نے ادارت کی ذمہ داری احمد مکی صاحب کو سونپی۔ اس زمانہ میں ان کا رسالہ "داستان" اپنے اونچے معیار اور روشن خیالی کی وجہ سے عوام میں بھی اور پڑھے لکھے طبقہ میں کافی مقبول ہو چکا تھا جب انہوں نے ایوان کی طرف توجہ دینی شروع کر دی تو اس کا براثر خود ان کے اپنے پرچہ داستان پر پڑھنے لگا چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ "ایوان" رو بہ ترقی تھا معیار کو بلند کرنے اور مقبول بنانے کے خیال سے ایوان میں فلمی حصہ بڑھا دیا گیا اور معمہ کا آغاز بھی ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں ایوان کا خاص "اداکار نمبر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ڈسمبر میں مختار صاحب اور مکی صاحب دونوں بمبئی گئے۔ اداکاروں سے ملاقاتیں ہوئیں، فوٹوز اور انٹرویوز لیے گئے اور ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں ایک خوبصورت اداکار نمبر شائع کر دیا گیا۔ اس نمبر میں موسیقار نوشاد، ہدایت کار کیدار شرما اور محبوب اداکار دلیپ کمار اور مکالمہ نویس خواجہ احمد عباس سے انٹرویوز بھی لیے گئے جو اس شمارے میں شامل ہیں اداکار نمبر کی مقبولیت دیکھ کر کرمانی صاحب کے حوصلے بڑھے اور دوسرے سال انہوں نے "حیدرآباد نمبر" کا اعلان کر دیا۔ یہ خاص نمبر مختار صاحب کے استقلال اور احمد مکی صاحب کی محنت اور ذوق و شوق کا آئینہ دار ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کی ادبی، سماجی اور ثقافتی رجحانات کا مکمل نقشہ بھی پیش کرتا ہے۔

داستان

۱۹۴۷ء میں احمد علی نے رسالہ "داستان" محترمہ زینت ساجدہ کی معاونت میں جاری کیا۔ داستان کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی اور تمام بیرونی اور مقامی مشاہیر کی قلمی معاونت حاصل تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اسی زمانہ میں احمد علی نے ایک فلمی رسالہ "جاری" جاری کیا تھا۔ جنوری ۱۹۵۱ء تک اخبارات کی اجازت ناظم المعلومات سے [illegible] لینی ہوتی۔ چنانچہ کافی تحقیقات پر اجازت ملتی تھی۔ چنانچہ احمد علی نے بھی اجرائے داستان کے لیے ۱۹۴۸ء میں درخواست دی اور اجازت ۱۹۴۹ء میں ملی۔ ۱۹۴۹ء میں یہ کام کوتوال صاحب بلدہ کو تفویض کیا گیا اور ایڈیٹر کے لیے میٹرک کامیاب ہونے کی شرط عائد کی گئی۔ چنانچہ سابقہ مدیران اور ناشرین کو بھی اجازت نامہ کی تجدید کرانی پڑی۔ اور حمید اللہ خان صاحب نائب کوتوال کے روبرو کارروائی کی تکمیل ہوئی۔ اسی زمانہ میں دہلی کے فسادات سے تنگ آکر حضرت خواجہ حسن نظامی قبلہ مرحوم بھی حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے اور اپنا رسالہ "منادی" یہاں سے نکالنا چاہتے تھے مگر میٹرک کی سند نہ ہونے کی وجہ سے انہیں دقت اٹھانی پڑی۔ ان کے صاحبزادے کے نام پر اجازت نامہ ملا اور منادی کے چند شمارے حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ داستان اور منادی عزیزیہ پریس میں چھپتا تھا جو نامپلی واقع تھا یہاں احمد علی صاحب کی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں عرش محی الدین صاحب نے بھی ایک معیاری رسالہ "سویرا" جاری کیا تھا۔ اس کے ایک شمارہ میں مخدوم محی الدین کا ایک شعر شائع ہوا تھا جس کا ایک مصرعہ تھا ؎

"خدا سویا ہوا تھا جل رہی تھی شمع شیطانی"

اس پر بڑا ہنگامہ مچایا گیا تھا ۱۹۴۸ء کے بعد سے تو صحافت کو ہر شخص نے تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا تھا اور بے تحاشہ ماہنامے، ہفت روزہ اور روز نامے ابل پڑے تھے۔

رسالہ داستان اپنے وقت کا معیاری ادبی رسالہ تھا اس میں کرشن چندر، میراجی، اختر الایمان ابو یوسف زئی، ابراہیم جلیس، رفیعہ سلطانہ اور قدوس صہبائی کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد تک یہ پرچہ جاری رہا لیکن اس کے بعد چونکہ احمد مکی صاحب کی توجہ "ایوان" کی جانب مبذول ہو گئی تھی اس لیے اسے بند کر دیا گیا

محترمہ زینت ساجدہ اس زمانہ میں ایم اے کی طالبہ تھیں ان کی افسانہ نویسی کا یہ ابتدائی دور تھا

پ اسی زمانہ میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ... شائع ہوا

۱۹۴۱ء میں شبیر احمد حاتمی نے گشتی کتب خانہ کے رسالے "ہماری کتابیں" کی ترتیب کا کام مکی کو سونپیں ۱۹۴۲ء تک نکلتا ... آزاد کراچی کے ہمراہ پر انہوں نے اسی سال "داستان" جاری کیا جس کی مجلس ادارت میں زینت ساجدہ کے علاوہ ابراہیم صہبائی بھی تھے احمد مکی کے رسالہ "نظم زاد" میں ابراہیم جلیس کے مضامین کی شمولیت ضروری تھی۔ اس کا ایک خاص نمبر "خواتین نمبر" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں عصمت چغتائی سے لے کر اس دور کی تمام خواتین کے مضامین تھے بعد میں یہ پرچہ علی صدیقی صاحب موجودہ ایڈیٹر "ابن الوقت" کو فروخت کر دیا گیا جو چند مہینے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر مہرہ نے پندرہ روزہ "فلمی موج" کے لیے احمد مکی صاحب کی خدمات حاصل کیں جسے ۱۹۵۵ء تک انجام دیتے رہے، جب ڈاکٹر مہرہ صاحب کو سرکاری ملازمت بحیثیت ڈسٹرکٹ سرجن نظامیہ دواخانہ مل گئی تو انہوں نے فلمی موج کو بند کر دیا فلمی پرچوں سے وابستگی کے نتیجہ میں احمد مکی صاحب کو فلمی دنیا کے بارے میں لکھنے لکھانے کا کافی شوق بڑھ گیا چنانچہ ان کے بیشتر مضامین روزنامہ "سیاست" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ صبا اور سب رس میں بھی ان موضوعات پر مکی صاحب کے مضامین چھپ چکے ہیں ۱۹۶۰ء تک احمد مکی صاحب بہر حال کسی نہ کسی طور پر اردو صحافت سے وابستہ رہے۔

ماہنامہ داستان کے پہلا شمارہ کافی وقیع بھی اور وزنی بھی تھا۔ ادارۂ تحریر میں زینت ساجدہ کے ساتھ مظہر ممتاز اور جاوید عزیز کے نام بھی شامل ہیں۔ یہ شمارہ فروری ۱۹۴۷ء کو منظر عام پر آیا تھا پہلے شمارے کے لکھنے والوں میں زینت ساجدہ، امجد حیدرآبادی، علی اختر، جگر مراد آبادی، قرۃ العین حیدر، میکش، شاہد صدیقی، نظر حیدرآبادی، میراجی، اختر الایمان، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش

امجد یوسف زئی شامل ہیں۔ ان ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ داستاں کو ترقی پسند ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔

ابوالقلم خیالستان کے صفحہ کو ترتیب دیا کرتے تھے جن دوسرے نامور ادیبوں کا داستاں کو قلمی تعاون حاصل تھا ان میں نصیر الدین ہاشمی، غلام ربانی، محبوب حسین جگر، عمران انصاری، اختر ہوشیارپوری، خبر درج سلطان پوری، میراجی، عالم خوندمیری، ولیس احمد ادیب، خمور جالندھری، عطا کلیانوی، رشید کوثر، حسن سردار انجام، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، مسلم ضیائی، خورشید احمد جامی، عبادت بریلوی، گرچن سنگھ، شاعر نظامی، اوج سعید، ابراہیم جلیس، اشکش، رؤف حسینی، شاہد ادیب، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش، تاباں، لطیف ساجد، سلطانہ عزیز، مہتاب قدر، مہاشر اور تحسین سروری وغیرہ وغیرہ۔

داستاں کے ادارۂ تحریر سے زینت ساجدہ کے علاوہ مظہر ممتاز اور جاوید عزیز بھی وابستہ تھے۔

الہدیٰ

۱۹۴۸ء میں مولوی عبدالحمید خاں نے ادارہ روزنامہ رہبرِ دکن سے علیحدگی اختیار کر کے رسالہ الہدیٰ جاری کیا۔ الہدیٰ نے بہت سے ٹھوس اور تحقیقی مقالے پیش کیے۔ مجلسِ اقوام متحدہ کے اصول و قوانین، سوشلزم، کمیونزم اور اسلام نیز موجودہ جمہوریت پر تبصرہ و تنقید و موازنے دیکھنے پڑھنے اور سمجھنے اور یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ مذہبی مضامین کے مطالعہ سے علم میں وسعت اور قلب و نظر میں روشنی پیدا ہوتی ہے الہدیٰ کی زندگی کا دور ۱۹۴۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۵۰ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عابد انصاری صاحب کے الفاظ میں عبدالحمید خاں مرحوم شبانہ روز کی محنت اور مفلسی کی تاب نہ لا کر جاں بحق واصل ہو گئے۔ اور میں جو سخت جاں اور نوجواں تھا بچ گیا۔ مگر فاقوں کی تاب نہ لا کر نظام آباد اپنے وطن چلا گیا۔

عابد انصاری صاحب کے رسالہ عطار جب بند ہوا تو وہ بھی عبدالحمید صاحب کی معیت میں الہدیٰ سے وابستہ ہو گئے۔ الہدیٰ جب جاری ہوا تو حیدرآباد کے عوام عجیب قسم کی افراتفری کا شکار تھے

خصوصاً مسلمانوں میں بڑی بے چینی اور مایوسی پائی جاتی تھی۔ اکثر مسلمانوں نے ہند میں حیدرآباد کے انضمام کو مسلمانوں کی شکست سمجھا اور وہ احساسِ اعلائی کا شکار ہو گئے اور یہی احساس عرصہ دراز تک انہیں ہندوستان کی ہمہ جہتی ترقی میں شریک ہونے سے روکے رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ احساس غلط ثابت ہوتا گیا۔ اسی انتشارِ ذہنی کے دور میں الہدیٰ کی اجرائی عمل میں آئی۔ الہدیٰ کے معیار کی۔ عبدالحمید خان مرحوم کے فکر و تدبر کی اور عابد انصاری کے زورِ قلم کی اس زمانہ میں دھوم تھی۔ مولانا مناظر حسین گیلانی نے پہلے پہل اپنے نام سے اور پھر "ابنِ آدم" بن کر بہت کچھ لکھا۔ عابد انصاری نے "جبرئیل" کا نام اختیار کیا۔ مولانا ماجد نے اندازِ تحریر سے پہچان لیا اور صدق میں لکھا۔ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش: من اندازِ قدت را می شناسم۔ مولانا مناظر حسن گیلانی ایک دن دفتر الہدیٰ مجرد گاہ منم جاہی مارکٹ پر تشریف لائے اور مدیر الہدیٰ سے کہا "بھئی! کسی دن عابد انصاری سے ملاؤ۔ اس کا اندازِ تحریر بڑا متاثر کن ہے۔" عابد انصاری خوشی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے اور مکرر سلام کیئے۔ کہنے لگے "تم ہی ہو؟! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ عابد صاحب نے کہا "مولانا میں دعا مانگتا ہوں آپ آمین فرمائیے۔ پھر عابد صاحب نے دعا مانگی۔ "خداوندا! یا تو مرا اندازِ تحریر مولانا کو دیدے یا مولانا کا علم مجھے عطا فرما"۔ مولانا ہنس پڑے، آمین کہا پھر فرمایا بھئی تمھارا اندازِ تحریر اب ہمیں کہاں سے آئیگا ہاں سارا علم تمھیں مل جائے!

مولانا عبدالحمید خان صاحب پر کام کا بوجھ بڑھ گیا۔ وہ ایک لائق و فائق، قابل و فاضل اور سنجیدہ فکر صحافی تھے۔ صحافت کے ذریعہ قوم کی ٹھوس خدمت کے سامنے پوری سنجیدگی سے اور مدلل طور پر قوم کی ترجمانی کرنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ افسوس ایسا مخلص اور قابل صحافی افلاس اور تنگدستی کا شکار ہو گیا۔ عابد انصاری کے الفاظ میں وہ فنا فی الصحافت ہوئے۔ افلاس، فکر اور صحافتی محنت کے دباؤ نے انھیں سیل جیسی بیماری کا تحفہ دیا اور اسی عارضہ میں انتقال فرما گئے۔ ان کے انتقال کی وجہ سے ۱۹۵۰ء میں الہدیٰ بند ہو گیا۔

ہفتہ وار نیا دور

مخدوم محی الدین عملاً صحافت سے وابستہ تو نہیں تھے لیکن ان لوگوں میں ضرور شامل تھے جن کا تذکرہ اخباروں میں آئے دن ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ ان کا وہ جوش و ولولہ تھا جو حصول آزادی کے لیے اور ایک نیا آدم کی تخلیق کے لیے ان میں پیدا تھا گو انہوں نے ۱۹۵۱ء میں "نیا دور" جاری کر کے صحافی کی حیثیت سے شریک کارواں ہو جاتے ہیں لیکن اس سے قبل ہی انہوں نے ترقی پسند تحریک کے ذریعے ادب میں بھی اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے ذریعہ عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور یہ مقبولیت ان کی آخری وقت تک باقی و برقرار رہی۔ ۱۹۶۷ء میں تو "جشن مخدوم" زبردست پیمانے پر منایا گیا اس جشن کے اہتمام میں روزنامہ "سیاست" نے نمایاں کام انجام دیا۔ اور اس اخبار کے ذریعہ پوری پوری پبلسٹی دی گئی۔ پانچ ہزار کا کیسہ زر بھی پیش کیا گیا تھا اور ان کے مکمل مجموعۂ کلام کو "بساطِ رقص" کے نام سے شائع بھی کیا گیا۔ "صبا" اور "نیا آدم" کے ضخیم "مخدوم نمبر" بھی شائع ہوئے جو بجائے خود دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ مخدوم محی الدین کا ۲۵ اگسٹ ۱۹۶۹ء کو قلب پر شدید حملہ کے نتیجہ میں دہلی کے ارون ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ تو سارے ملک اور خصوصاً حیدرآباد میں زبردست سوگ منایا گیا۔ حیدرآباد کے سبھی ادیب شاعر اور صحافی تو سوگواروں میں شریک تھے لیکن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے علاوہ کانگریس کے رہنماؤں نے بھی اظہار غم کیا حد تو یہ کہ مخدوم عمر بھر شاہی کی مخالفت کرتے رہے لیکن جب ان کا انتقال ہوا تو پرنس اعظم جاہ نے بھی اظہار تعزیت کیا۔ اس سے مخدوم کی ہر دلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہم ذہنی اور فکری اعتبار سے مخدوم کی لاکھ مخالفت کریں لیکن ان کی شخصیت کا یہ سحر تھا کہ ہر شخص کھنچا چلا آتا تھا جس طرح ان کی شاعری اور آواز میں جادو تھا اسی طرح ان کی شخصیت میں بھی سحر تھا۔

نیا دور، اس دور کی یاد تازہ کرتا ہے جبکہ حیدرآباد ایک وسیع آزاد، سیکولر اور جمہوری ملک

ہندوستان کا جز و بن گیا تھا اور پہلے عام انتخابات کی آمد آمد تھی اس زمانہ میں ان کا رزمیہ گیت فضاؤں میں گونج رہا تھا شہر بھر کے بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں کے زبان پر بس یہی نغمہ تھا۔ میں کوئی آٹھ برس کا رہا ہوں گا سب سے پہلے میں نے اسی نغمہ کو سنا ہے اور سب سے پہلی مرتبہ میرے کان مخدوم کی سحر انگیز آواز سے آشنا ہوئے۔ وہ نغمہ کیا تھا جادو تھا، مخدوم کے ساتھ ان کا یہ نغمہ بھی زندۂ جاوید رہے گا۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی، مزدوروں کی
وہ دنیا، دنیا کیا ہوگی
جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا
مزدوروں کا جسمیں راج نہ ہو

دراصل کمیونسٹوں کا یہ خیال تھا اور شاید اب بھی ہے کہ آزادی کے باوجود بھی عوام آزادی کے ثمرات و برکات سے کما حقہ مستفید نہیں ہو رہی ہے سرمایہ داری کا اثر جوں کا توں برقرار ہے اس لیے مخدوم نے اس آزادی کو آزادی تسلیم نہیں کیا۔ جسمیں مزدوروں کا مزاج نہ ہو وہ آزادی بے معنی ہے یہ تو مخدوم کا بھی اور پارٹی کا بھی خیال ہے اسی خیال کو ایک اور ممتاز شاعر اور مخدوم کے رفیق شاہد صدیقی نے یوں ظاہر کیا ہے۔

رہائی مل گئی لطفِ رہائی سے مگر محروم
تو کیا ہم نے یہ چاہا تھا کہ زنجیریں بدل جائیں

مخدوم کے خیالات سے مجھے ہمیشہ ہی اختلاف رہا ہے جشن سے قبل میں نے اردو مجلس کے اجلاس میں مخدوم صاحب کی موجودگی میں اپنا مضمون "مخدوم۔ فکر و فن کے چند پہلو" پڑھ کر سنایا جو بعد میں سیپ (کراچی) اور پھر میرے مضامین کے دوسرے مجموعہ "اور اک معنی" میں شامل ہے۔ ایک طبقہ تو اس مضمون پر چراغ پا ہوگیا۔ چونکہ مخدوم اختلاف رائے کا احترام کرتے تھے اس لیے انہوں نے برا نہیں مانا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ بہت بڑے آدمی تھے گو ان کا رشتہ اردو صحافت سے عملاً کوئی زیادہ نہیں رہا تاہم جو بھی رہا ہے اس سے اردو صحافت کا سر اونچا ہوتا ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ میں "نیا دور" عظمت کی علامت ہے اسی طرح جس طرح مخدوم کی ذات ہماری سیاست کے لیے وجۂ افتخار تھی۔

ماہنامہ گلشن

حیدرآباد سے شائع ہونے والے بچوں کے رسائل میں محمود انصاری کے رسالہ "گلشن" کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ محمود انصاری بچپن ہی سے اردو صحافت سے وابستہ رہے ہیں گو ان کی تعلیم انگریزی ذریعۂ تعلیم سے ہوئی اور وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے طالب علم رہے ہیں لیکن اردو سے ان کی دیوانہ وار محبت اور صحافت سے دلی وابستگی کا نتیجہ ہے کہ وہ سائنس کی دنیا چھوڑ کر صحافت سے مستقلاً وابستہ ہو گئے۔ یوں تو ان کے مضامین اور کہانیاں بچوں کے بیشتر صفحوں میں شائع ہوتے رہے لیکن بچوں کے ادب سے ان کی دلچسپی کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں ماہ نامہ "گلشن" حبیب الرحمن کی اشتراکیت میں جاری کیا اور بعد میں وہ اس کے تنہا مدیر تھے۔ ماہ نامہ "گلشن" ۱۹۵۴ء میں جاری ہوا اور چھ سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں بند ہو گیا۔ اس مختصر سی مدت میں ماہ نامہ کو بچوں کے حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی چنانچہ اس کے قلم کاروں میں تمام نوعمر لکھنے والے شامل تھے۔ گلشن میں کہانیوں نظموں اور ڈراموں کے علاوہ کارٹون اور لطیفے بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اصل میں بچوں کی دنیا، تارے اور نونہال کے بند ہونے کے بعد گلشن ہی واحد رسالہ تھا جو حیدرآبادی بچوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔

تقریباً پانچ چھ سال تک شائع ہونے کے بعد گلشن بھی اجڑ گیا۔ بچوں کے اس گلشن کی بربادی کے بعد مسعود انصاری فرزند منظور حسن صاحب سابق ایڈیٹر رہنمائے دکن نے کوشش کی کہ اس اجڑے چمن کی آبیاری کریں چنانچہ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے ماہ نامہ "ننھا" جاری کیا کہ لیکن وہ بھی بہت جلد حالات کا شکار ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ بچوں کا کوئی معیاری رسالہ اب تک جاری نہ ہوسکا۔ اس دوران میں عظیم صدیقی (شاہد عظیم) نے بھی بچوں کا پہلا ڈائجسٹ "میرا رسالہ" ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تھا لیکن یہ کوششیں بھی بار آور ثابت نہ ہوئی۔ گلشن کے ہمعصر رسائل میں اعظم ذوالفقار اور شجاعت، دوست اور حیدر الدین بدر و الیاس فاروقی شبنم نے نونہال بھی جاری کیے تھے۔

"گلشن" کے بند ہونے کے بعد محمود انصاری نے ۱۹۶۲ء میں ہفتہ وار کاکل جاری کیا۔ یہ ایک ادبی ہفتہ وار تھا اس رسالہ سے بھی محمود انصاری نے ۱۹۶۷ء میں دستبرداری اختیار کی اور ان کی جگہ احمد جلیس نے ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ افسوس کاکل بھی جلد بند ہوگیا۔

محمود انصاری عرصہ دراز تک روزنامہ "سیاست" سے وابستہ رہنے کے بعد پچھلے تین سال سے روزنامہ "منصف" جاری کیا ہے۔ روزنامہ "منصف" اپنی میانہ روی سنجیدگی اور سیکولر اندازِ فکر کی وجہ سے روز بروز عوام کا مقبول اخبار بنتا جارہا ہے۔

مجلس

سہ ماہی

اردو مجلس حیدر آباد کے ترجمان کی حیثیت سے ایک سہ ماہی رسالہ "مجلس" اکٹوبر ۱۹۵۸ء سے جناب منظور احمد صاحب منظور اور ڈاکٹر مغنی تبسم کی ادارت میں اردو ہال حمایت نگر سے شائع ہوا۔ اس ادبی جریدہ میں حیدر آباد کے علاوہ ملک بھر کے ممتاز دانشور اور قلمکار لکھتے رہے۔ خاص کر اردو مجلس میں پڑھے جانے والے مضامین شامل کیے جاتے تھے اردو مجلس کے تحت مختلف یوم منائے جاتے تھے ان موقعوں پر پڑھے گئے مضامین خصوصی اشاعتوں میں شامل کیے جاتے۔ چنانچہ مجلس کے مولوی عبدالحق نمبر، غالب نمبر، اور مومن نمبر (یادگار مومن) شائع ہوئے۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق نے مجلس کے خصوصی نمبر کی بے حد ستائش کی۔

اس جریدہ کے مضمون نگار حضرات میں پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر روزمیدہ سپہر ثمینہ شوکت، خلیق انجم، اسلوب احمد انصاری، نثار احمد فاروقی، حکیم اسرار احمد، عبادت بریلوی منشی دھرو دیا لنکار، سجاد مرزا وغیرہ شامل تھے۔

یہ موقر رسالہ ختم ۱۹۶۱ء تک نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ آخری زمانہ میں مولوی منظور احمد منظور کی ادارت میں نکلتا رہا۔ منظور صاحب ان دنوں اقبال اکیڈمی سے شائع ہونے والے سہ ماہی "اقبال ریویو" کے مدیر ہیں۔

ماہنامہ پیکر

اعظم راہی نے ۱۹۵۸ء میں حیدرآباد سے نوجوانوں کا ایک نئی قدروں والا ماہ نامہ "پیکر" جاری کیا۔ اس کے لکھنے والوں نے آگے چل کر ادبی دنیا میں اپنا ایک مخصوص حلقہ بنا لیا تھا جو "پیکر گروپ" سے موسوم ہوا۔

"پیکر" ایسے زمانہ میں شائع ہوا جبکہ ادبی دنیا میں "ترقی پسندی" کا بول بالا تھا ایسے میں عصری حسیت اور ادبی جذبات و احساسات کا احترام اور نئی پرانی قدروں کی پہچان اس نئی نسل کا کارنامہ ہے۔ پیکر کے لکھنے والوں میں اعظم راہی کی رفیق حیات ہادیہ شبنم رفیق کار بھی تھیں۔ جگدیش بل بھی پیکر سے وابستہ رہے ہیں۔ پیکر کے مضمون نگاروں میں احمد جلیس، رؤف خلش، حسن فرخ، مسعود عابد، ساجد اعظم، غیاث متین، انور رشید، زکی انور، رفعت صدیقی، عظیم صدیقی انیس قیوم، اعظم ذوالفقار اور رضا الجبار وغیرہ شامل تھے۔

اعظم راہی اور ان کے ساتھیوں نے "جشن پیکر" منا کر جدید ادب کی جدید قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ حیدرآباد میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے "مکتبہ" کے ذریعہ فن افسانہ نگاری کو جو تحریک عطا کی تھی اور جس کے نتیجہ میں حیدرآباد میں اردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل سامنے آئی تھی اس کے بعد پیکر نے اسی کام کو عرصۂ دراز بعد آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں پیکر کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ اعظم راہی نے پھر ایک مرتبہ پیکر کو نئی زندگی عطا کرنے کی کوشش کی اور بمبئی سے اس کے دو ایک شمارے بھی شائع ہوئے لیکن اس کوشش میں وہ ناکام رہے ہے۔ اب بھی ان کے عزائم جواں ہیں اور ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنے احباب کے تعاون سے پیکر کی دوبارہ اشاعت عمل میں لائیں گے۔

ماہنامہ صبا

اُردو ادب کا دوسرا انقلابی دور سنہ ۱۹۳۶ء سے رفاہ عام کلب (لکھنو) میں جب پریم چند کے زیر صدارت ترقی پسندوں کی کانفرنس کے انعقاد سے شروع ہوتا ہے۔ شمالی ہند نے ادبی رجحانات سے روشناس ہونے لگا اور اب سرسید کے بعد ہی سے اُردو شعر و ادب سماج پر حاوی ہوتا چلا گیا ادب اب جذبۂ درون کا ترجمان ہی نہیں قوم و ملک کا رہبر و رہنما بن گیا۔ نئے افکار اور نئے تصورات ادب ہی کے ذریعہ عوام کی زندگی میں داخل ہونے لگے۔ چنانچہ ان جدید تبدیلیوں سے حیدرآباد بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ یہاں پر بھی جیسا کہ میں نے اس سے قبل لکھا ہے علی گڈھ تحریک کے حیات آفروز افکار کا پرتو پڑنے لگا تھا اور اسی طرح جب ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد کے ادیب اُردو دانشوروں نے اس تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا سنہ ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لایا گیا اس انجمن کے قیام کے سلسلہ میں جناب عابد علی خان اور مخدوم محی الدین پیش پیش رہے ہیں۔

"صبا" بلا شبہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا لیکن روایت سے بغاوت کا مجرمانہ رجحان اتنی شدت سے یہاں موجود نہیں تھا جتنا دوسرے ترقی پسند رسائل کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی شمارے میں سلیمان اریب نے ماہ نامہ کی بنیادی پالیسی کو واضح کر دیا۔

صبا کی مجلس مشاورت میں حبیب الرحمٰن، فضل الرحمٰن، یوسف حسین خان، طاہر علی خان مسلم، جانکی پرشاد، سید محمد، رفیعہ بیگم، کلیم اللہ، عالم خوند میری، حفیظ قتیل، سری رام شرما، رشید الدین خان

دلاور علی خان، سری کانیواس لاہوتی اور (خازن) میر عابد علی خان شامل تھے۔

بلا شبہ "صبا" کے صفحات پر "قصۂ قدیم و جدید" کو جگہ ملی ہے لیکن یہ بحث برائے بحث نہیں بلکہ اقدار کی بازیافت اور ایجاد و اختراع کے لیے ہوتی رہی۔ "صبا" نے ابتداً ہی سے جس پالیسی کو اپنایا تھا روزِ آخر تک اس پر قائم رہا۔ اس وجہ سے "ترقی پسند" ہوتے ہوئے بھی "خالص ادبی و علمی" پرچہ تھا۔ چنانچہ جہاں اس کے صفحات پر "ترقی پسند مصنفین" کی تنظیم کے مستقبل کے بارے میں مباحث کو جگہ ملی ہے وہیں "اردو زبان کا رسم الخط" کے زیرِ عنوان سمپوزیم بھی شائع ہوا۔ "صبا" کو اس بات کا بھی اعزاز ہے کہ اس نے "شبلی نمبر" پیش کیا۔ "صبا" کے قوم پرستانہ رجحانات کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب ہند و پاک لڑائی ہوئی تو اس کے بعد ہی "کشمیر نمبر" شائع کیا گیا۔ حال ہی میں اس کا ایک "مخدوم نمبر" چھپا ہے جس میں "جشنِ مخدوم" کی مکمل روئداد چھپی ہے اردو کانفرنس نمبر بھی تاریخِ ادبِ اردو میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

"صبا" کا دوسرا شمارہ (جولائی ۱۹۵۵ء) انجمن ترقی پسند مصنفین کے مستقبل کے بارے میں بحث شائع ہوئی تھی۔ اس بحث کا آغاز عالم خوندمیری کے مضمون سے ہوا جو "ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کا مستقبل" کے عنوان سے انجمن سوائی مصنفوں کے ہفتہ وار جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس بحث میں عالم (پروفیسر) کے علاوہ امجد یوسف نبی، شاہد صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، نارائن شرما، عینی شاہد، سلیمان اریب، سردار سلیم، رئیس الدین فریدی اور حامد قادری نے حصہ لیا۔

دیگر معاصرین کی طرح "صبا" تحفظِ زبان کے معاملہ میں یکساں طور پر دلچسپی لیتا رہا ہے۔ چنانچہ "اردو زبان کا رسم الخط" کے زیرِ عنوان سمپوزیم کی اشاعت (مئی ۱۹۵۶ء) اور اردو کانفرنس نمبر (نومبر ۱۹۵۶ء) کی خصوصی اشاعتیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ دوسرے شمارے میں انجمن ترقی اردو (مرکزی) کی جانب سے آل احمد سرور کا بھیجا ہوا سوالنامہ بھی شائع ہوا۔ اس سمپوزیم میں سبھی ادیبوں نے رسم الخط کی تبدیلی کی مخالفت کی۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ رسم الخط زبان کا رنگ روپ ہوا کرتا ہے جس سے وہ جانی پہچانی جاتی ہے۔ رسم الخط میں تبدیلی کے معنے انفرادیت کا خاتمہ ہے اردو زبان کے رسم الخط میں تبدیلی کا مطلب اردو زبان کی موت ہے۔

نومبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں حیدرآباد میں منعقدہ کانفرنس کی مکمل رپورٹ "صبا" نے شائع کی اس کانفرنس کی معتمد زینت ساجدہ اور معتمد عمومی حبیب الرحمن تھے۔ اس کانفرنس کی وجہ سے اردو زبان کے موقف کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔ اور اس زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے مستقبل میں امکانات کا جائزہ لیا گیا۔

"صبا" نے جہاں ادبی اور لسانی اعتبار سے اردو زبان و ادیب کی خدمت انجام دتا ہے وہاں قومی یکجہتی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کافی تعاون کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے زیر عنوان (جلد ۳ شمارہ ۸ و ۹) میں مضامین پیش کیے گئے۔ گوپی چند نارنگ، نصیر الدین ہاشمی، عزیز قیسی اور حسن نعیم کے مضامین اس شمارہ میں شامل تھے۔ خود کشمیر کا خاص نمبر (جلد ۱۰ نمبر ۱۰ اور ۱۱) قومی رجحانات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دفاعی نوعیت رکھتا ہے۔

جلد ۹ کا ۷ و ۸ واں شمارہ قومی یکجہتی نمبر تھا ہندوستان کی ترقی اور ہندوستانی جمہوریت کی بقا کے لیے اس ہمہ لسانی اور ہمہ مذہبی ملک میں قومی اتحاد کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں ادب کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت فاضل مضمون نگاروں کے مضامین شامل ہیں۔ حیدرآباد میں جب جشن مخدوم منعقد ہوا تو اس میں پڑھے گئے تمام مضامین اور دیگر ادیبوں سے لکھائے گئے نگارشات پر مشتمل "صبا" نے اپنا مخدوم نمبر جلد ۱۱ شمارہ ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ شائع کیا۔

اریب کا ستمبر ۱۹۷۰ء کو بعارضۂ کینسر انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد "صبا" کی زندگی کا خاتمہ یعنی تھا لیکن صفیہ اریب جو خود بھی اچھی ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں صبا کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ دو ایک شمارے شائع ہونے کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

اضلاع کے ادبی رسائل

ریاست حیدرآباد مرحوم یکم نومبر ۱۹۵۶ء سے قبل سہ لسانی علاقوں پر مشتمل تھی۔

(۱) تلنگانہ (۲) مرہٹواڑہ (۳) کرناٹک

تلنگانہ کے اضلاع میں محبوب نگر، نلگنڈہ، ورنگل، کریم نگر، میدک، نظام آباد عادل آباد،

مرہٹواڑہ کے اضلاع، اورنگ آباد، عثمان آباد، ناندیڑ، بیڑ، اور پربھنی۔ کرناٹک کے اضلاع، گلبرگہ، بیدر اور رائچور شامل تھے۔ ورنگل اور گلبرگہ کو صوبوں کے صدر مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ جس طرح شہر نگاراں حیدرآباد علم وفن کا گہوارہ رہا ہے اسی طرح اضلاعِ حیدرآباد میں بیشتر شہر ادبی اور لسانی اعتبار سے اپنی تاریخ رکھتے ہیں۔ خصوصاً اورنگ آباد کو دکن کی کھڑکی کی حیثیت حاصل ہے۔ زبان کے علاوہ تہذیب وتمدن علم وفن اور سیاست وحکمت نے بھی اسی راستہ سے دکن میں قدم رکھا ہے۔ گلبرگہ تو زبان وادب، تہذیب وثقافت اور مذہب وسیاست کا گہوارۂ اول ہے۔ یہیں حکومت مضبوط ہوئی اور تہذیب کی پرورش بھی، علم وفن کو فروغ حاصل ہوا، اور یہی سرزمین بندہ نوازؒ اردو زبان وادب کا اولین مرکز بن گئی۔ بیدر بھی عرصہ دراز تک بہمنیہ سلاطین کی وجہ سے علم ودانش کی درس گاہ بنا رہا۔ ورنگل کی اپنی تاریخ ہے۔ اسی

تاریخ، ادبی تمدنی اور لسانی پس منظر میں اردو صحافت پروان چڑھتی رہی ہے۔ بلاشبہ ان تمام اضلاع سے کبھی بھی کوئی اہم روزنامہ جاری نہیں ہوا، لیکن رسائل کے معاملہ میں اکثر ضلعوں سے بعض اہم ہفتہ وار اور ماہنامے، سالنامے جاری ہوئے۔ جن اضلاع کو تاریخ اردو صحافت میں اہمیت حاصل ہے۔ ان میں اورنگ آباد، گلبرگہ، ورنگل، بیدر، نظام آباد، کریم نگر، اور حیدرآباد بطور خاص شامل ہیں۔ ان مقامات سے وقتاً فوقتاً معیاری اور مفید ادبی رسائل جاری ہوئے اور بعض تو تاریخ ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جو رسائل یکم نومبر ۱۹۵۶ء سے قبل شائع ہوئے انھیں رسائل کا ذکر یہاں کیا جائے گا۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کے بعد بھی علاقہ مرہٹواڑہ اور کرناٹک سے بہت سے نئے رسائل جاری ہو رہے ہیں، لیکن ان کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ تنظیم جدید کے بعد اورنگ آباد، بیڑ، پربھنی، ناندیڑ، اور عثمان آباد ریاست مہاراشٹرا میں اضلاع گلبرگہ، بیدر اور رائچور، ریاست میسور، (کرناٹک) میں ضم ہو چکے ہیں۔ علاقہ آندھرا اور اضلاع تلنگانہ کے انضمام سے نئی ریاست آندھرا پردیش وجود میں آئی۔

اضلاع مرہٹواڑہ میں اورنگ آباد کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور لسانی اعتبار سے بھی اس کا تاریخی موقف بڑا اہم رہا ہے۔ اس کو دکن کی دلی بھی کہا جاتا تھا، کیونکہ شمال سے آنے والی ہر سیاسی اور تہذیبی تحریک اس شہر کو اپنا مسکن بنا لیتی، جتنے کارواں آئے یہیں ڈیرہ ڈال دیا اور سیاسی لحاظ سے دکن کی فتح کے بعد مسلم بادشاہوں نے اپنی رہائش گاہ اسی شہر کو بنایا۔

محمد تغلق نے تو ایک دفعہ اس شہر کو پورے ملک ہندوستان کا دارالخلافہ ہی بنا دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کا تو یہ مستقل مستقر رہا ہے۔ اور جب آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو یہ نو قیام ریاست کا پہلا دارالسلطنت تھا۔ اس طرح اورنگ آباد شمالی ہند کی تحریکوں اور تبدیلیوں سے راست متاثر رہا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے

معاملہ میں یہ شمالی ہند کی ترقی یافتہ اور خصوصاً دلی کی ٹکسالی اور درباری زبان سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ اس وجہ سے اورنگ آباد ریاست حیدرآباد کا ایک اہم لسانی شہر بھی تھا اور ادبی و تہذیبی اعتبار سے اس کی ایک خالص جگہ بھی ہے۔ تاریخ صحافت اردو میں ہم شہر اورنگ آباد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اضلاعی رسائل میں سب سے پہلے یہیں سے ادبی رسائل کی اجرا عمل میں آئی۔ اور یہاں کے رسائل نے ادب کا ایک خاص معیار بھی پیش کیا ہے۔ مولوی فدا حسین نے جب اورنگ آباد کو اپنی وکالت کے لئے منتخب کیا اور وہ حیدرآباد سے منتقل ہو گئے تو انھوں نے سنہ ۱۸۹۲ء میں اپنا قانونی رسالہ "آئین دکن" یہیں سے جاری کیا۔ یہیں سے ان کو بھی اور ان کے رسالہ کو شہرت نصیب ہوئی اور سنہ ۱۸۹۳ء تک برابر اورنگ آباد ہی سے "آئین دکن" شائع ہوتا رہا، حالانکہ مولوی صاحب حیدرآباد منتقل ہو جاتے ہیں۔ آئینی اور قانونی ادب میں "آئین دکن" کی اہمیت اور افادیت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔

"آئین دکن" کے بعد اورنگ آباد سے شائع ہونے والا علمی و ادبی اور تعلیمی رسالہ ماہنامہ "اورنگ آباد ٹیچر" مولوی کریم احمد خاں کی زیر ادارت جاری ہوا۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے جاری ہونے والا یہ رسالہ برسہا برس تک برابر شائع ہوتا اور تعلیمی تحریک کو عام کرتا رہا ہے۔ اس ماہنامہ میں تعلیمی امور سے متعلق مضامین ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی موضوعات پر مضامین اور شعرا کا کلام بھی شائع ہوا کرتا تھا۔

ماہنامہ "ندا" بھی سرکاری رسالہ تھا جو دکن ریڈیو کی نگرانی میں شائع ہوا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں "ندا" جاری ہوا۔ اس میں دکن ریڈیو کے پروگراموں کے علاوہ ادبی مضامین بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ "ندا" نے نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔

اورنگ آباد کا ایک اور ادبی رسالہ "نقش نو" تھا۔ جو تاج الدین تاج صاحب کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں تفصیلات حاصل نہ ہو سکے۔

اورنگ آباد سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں رسالہ "اردو" (سہ ماہی) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مولوی عبدالحق کا قیام جس زمانہ میں اورنگ آباد میں تھا انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی جاچکی تھی۔ رسالہ "اردو" ۱۹۳۸ء سے شائع ہونے لگا اور جب مولوی صاحب حیدرآباد منتقل ہو گئے تو "آئین دکن" کی طرح رسالہ "اردو" کا دفتر بھی حیدرآباد منتقل ہوگیا۔ رسالہ اردو خالص ادبی اور تحقیقی رسالہ تھا۔ اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے اس وقت کے رسائل میں سب سے زیادہ اہم رسالہ تھا۔ تحقیقی لحاظ سے رسالہ اردو نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اردو تحریک کی ترقی میں اس رسالہ کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اضلاع تلنگانہ میں ورنگل، نظام آباد، محبوب نگر اور کریم نگر کو اہمیت حاصل ہے ورنگل سے ۱۹۵۳ء میں شفیع الیاس کی ادارت میں ایک ہفتہ وار رسالہ "نئی کرن" شائع ہوا تھا۔

محبوب نگر سے وینکٹ رام نے ۱۹۵۴ء میں ہفتہ وار "مضافات" جاری کیا تھا جس کی نوعیت ایک رسالہ سے بڑھ کر اخبار کی تھی۔

عبدالعزیز صاحب عزیز عرصہ دراز سے ہفتہ وار "تعمیر" شائع کر رہے ہیں یہ ہفتہ وار بھی کم و بیش اخباری کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی خبریں جگہ پاتی ہیں، ادارتی کالم میں سیاسی مسائل زیر بحث آتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر اس میں ادبی مضامین بھی شامل رہتے ہیں اور غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ عزیز صاحب خود بھی اچھا شعری ذوق رکھتے ہیں اور مشق سخن بھی جاری ہے۔ "تعمیر" کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مسلسل اور پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

تاریخ اردو صحافت میں نظام آباد کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ مرتضیٰ مجتہدی کا "رومان" (۱۹۴۷ء) سب سے پہلے یہیں سے شائع ہوا تھا۔

اکبر حسین نے اپنا ہفتہ وار "خضر" (۱۹۶۳ء) بھی جاری کیا تھا۔ مرتضیٰ مجتہدی

اپنے چونکا دینے والے ہنسی پھیلانے والے اور انقلابی اندازِ تحریر کی وجہ سے مشہور ہوگئے جب کہ عابد انصاری (پرچا) نے اپنے تیکھے اور متاثر کن اندازِ نگارش کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہے ۔ مرتضیٰ مجتہدی کا "جنگ" (حیدرآباد) آج بھی جاری ہے ۔ عابد انصاری نے نظام آباد سے "پرچا" جاری کیا ہے ۔ "پرچا" ایک نیم سیاسی اور نیم ادبی رسالہ ہے ، جو پابندی سے ہر ہفتہ شائع ہورہا ہے ۔

مانیر اشاعت گھر کریم نگر سے کمال کریم نگری نے ایک ماہنامہ "مانیر" جاری کیا ۔ تانڈور ضلع حیدرآباد کا ایک تعلقہ ہے ۔ ریلوے لائین پر واقع ہونے کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے ۔

ادبی تاریخ میں اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اشاعت کی سہولتیں نہ ہونے کے باوجود مولوی عبدالسبحان صاحب نے یہاں سے ایک ماہنامہ "ندائے دکن" سنہ ۱۹۴۸ء میں جاری کیا تھا ۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ رسالہ مقبول ہوگیا تھا ۔ حافظ عبدالسبحان صاحب حیدرآباد کے پرانے صحافی ہیں ۔ انھوں نے سنہ ۱۳۳۰ء میں رہنمائے دکن کی نامہ نگاری کے ذریعہ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا ۔ اور وہ "مشیر دکن"، "صبح دکن"، "پیام"، "رعیت اور سیاست" کے لئے خبریں بھیجتے رہے ۔ "میزان"، "منزل"، "شعیب اور ملاپ" سے بھی ان کا ربط قائم تھا ۔ مولوی عبدالسبحان صاحب کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ادارہ "سیاست" نے اپنے نوٹ میں یوں لکھا ہے :

"جناب حافظ عبدالسبحان صاحب تانڈور کے قدیم صحیفہ نگار ہیں ، وہ تقریباً ربع صدی سے مختلف اخبارات کے لئے خبریں بھجواتے رہے ہیں وہ خود مختلف رسائل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور تانڈور میں کئی مرتبہ ادبی محفلوں اور مشاعروں کے انعقاد کا انتظام اور بیرونی ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دیا کرتے تانڈور کے مسائل سے ان کی واقفیت بہت گہری ہے ۔"

خواجہ بندہ نواز کی مقدس سرزمین گلبرگہ ، تاریخی ، تمدنی ، لسانی ، اور مذہبی لحاظ سے

غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہاں فیروز شاہ بہمنی نے دکن کی ملی جلی تہذیب کی بنا ڈالی ہندو مسلم کلچر نمودار ہوا ۔ یہاں قلعہ کی مسجد جو مسجد قرطبہ کا نمونہ پیش کرتی ہے اور آستانۂ بندہ نواز بن گیا ، وہیں چن بسیو شورا کا مندر ہندو فن تعمیر کا مظہر ہے ۔ لسانی لحاظ سے حضور بندہ نواز کی وجہ سے گلبرگہ اردو زبان و ادب کا اولین گہوارہ بن گیا ۔ اس خاکِ گُل و برگ سے کئی صوفی اولیا اٹھے اور کئی ادیب ، شاعر ، اور دانشور بھی ، تدبر و فراست ایسا کہ زمانہ دراز تک یہاں کے بادشاہوں نے دکن پر حکومت کی ۔ واقعہ تو یہ ہے کہ گلبرگہ کی خاک اہلِ دکن کی آنکھوں کا سرمہ بنی رہی ہے ۔ اور آج بھی آستانۂ بندہ نواز کی وجہ سے ذہن و قلب کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے ، علم و ادب کے اسی گہوارہ سے "ہمدرد" سنہ ۱۹۴۸ء میں عثمان صحرائی کی ، اور "گلبرگہ" حسام الدین اور اکرام صہبائی د سنہ ۱۹۵۶ء کی ادارت میں شائع ہوئے ۔ "ہمدرد" معیاری ادبی ہفتہ وار تھا ۔ "گلبرگہ" ملک بھر میں اپنے ادبی معیار کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا ۔

ادب کے جدید رجحانات کی پیش کشی اور ترجمانی میں گلبرگہ نے اہم رول ادا کیا ہے ۔ اس ماہنامہ کو ملک کے تقریباً سبھی اہم ادیبوں اور نامور شاعروں کا تعاون حاصل تھا ۔ گلبرگہ کے طلباء نے حیدرآباد میں اپنے دورانِ قیام میں گلبرگہ اسٹوڈنٹس کا نجم قائم کیا تھا جس کی طرف سے سنہ ۱۹۵۴ء میں وہاب عندلیب کی ادارت میں "انسان" شائع ہوا ، جس کے ادارۂ تحریر سے ظفر عالمگیر بھی وابستہ تھے ۔ اور اس رسالہ میں بلراج کومل کمال احمد ، نیاز حیدر ، ہنس راج رہبر ، سلیمان اریب ، پروفیسر وحید الدین اور خورشید علی کے مضامین شامل تھے ۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں گلبرگہ کے نجم الثاقب شحنہ نے بھی دو ماہی "گجر" شائع کیا تھا ۔ جو اپنے معیار اور مواد کی وجہ سے دلچسپی سے پڑھا گیا ۔

آستانۂ بندہ نواز سے ممتاز مذہبی جریدہ "شہباز" جاری ہوا ۔ حضرت محمد محمد الحسینی صاحب قبلہ سجادہ نشین بارگاہ نے ہمیشہ ہی سے اپنے اجداد کی طرح زبان و ادب اور مذہب و ثقافت کی سرپرستی کی ہے ۔ اور کر رہے ہیں ۔ اس لئے اپنے ہی کی دلچسپی اور جذبۂ خدمت

کے نتیجہ میں حضور بندہ نواز کے ملفوظات اور تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ فارسی و عربی تالیفات کا ترجمہ کروایا جا رہا ہے۔ اسی طرح صالح اور صحت مند ادب کو فروغ مل رہا ہے۔ ماہنامہ "شہباز" کی اجرائی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ مذہبی قدریں زندگی کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ اسلامی اصول زندگی کے اعلیٰ ترین اصول ہیں۔ حق، انصاف، مساوات، اور بھائی چارگی کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے وہ مثالی اور حیات انسانی میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلئے ان اعلیٰ ترین اور حیات آفریں اصولوں، قدروں کا پرچار از حد ضروری تھا اور ہے۔ "شہباز" نے بندہ نوازی تعلیمات کو عام کر کے اسی ضرورت کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ عرصہ دراز تک حکیم لیئق احمد نعمانی بندہ نوازی اور بعد میں پروفیسر مبارز الدین رفعت اس ماہنامہ سے وابستہ رہے۔ اس ماہنامہ میں ارشادات بندہ نواز کے علاوہ علماً اور ادیبوں کی نگارشات بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔ اور منظومات بھی۔

افسوس! کہ یہ اہم مذہبی رسالہ اب بند ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت آج بھی برقرار و باقی ہے۔

گلبرگہ کے علاوہ دکن میں اردو زبان کے قبلۂ دوم بیدر سے بھی ایک ہفتہ وار ۱۹۱۰ء میں "بیدر گزٹ" کے نام سے جاری ہوا تھا۔

بچوں کے رسائل

تاریخ اردو صحافت میں ابتدا ہی سے بچوں کے ادب کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے، جہاں مردان ہنر مند نے اردو صحافت کو اپنے ادب، فلسفہ اور سیاست کی جولان گاہ بنایا وہیں خواتین دکن نے اس کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اور ان میں صحیح ذوق ادب اور شعور زندگی پیدا کرنے کے لئے حیدر آباد کے ذہین صحافیوں نے مختلف رسائل و جرائد جاری کئے۔ ان رسائل کے علاوہ روزناموں نے ہر ہفتہ اپنے ایڈیشن میں بچوں کے لئے صفحے مختص کئے۔ جن میں کہانیاں، معلوماتی مضامین، لطیفے اور پیاری پیاری سبق آموز نظمیں شامل رہتیں۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں بچوں کی ایک نئی نسل سامنے آئی۔ اور آگے چل کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہے۔

حیدر آباد کے اداروں میں روزنامہ "میزان" اس حیثیت سے کافی اہم اخبار ہے جس نے بچوں کی لیگ قائم کی۔ اس لیگ کی شاخیں شہر سے پھوٹ کر اضلاع تک پھیل گئی تھیں اور ممبروں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ اس لیگ کے باضابطہ ماہوار ادبی جلسے ہوا کرتے تھے۔ اور ان جلسوں کی روئداد میزان میں شائع ہوا کرتی۔ بچوں کے لئے غلام محمد مالک میزان نے بیا جس بھی بنوائے تھے۔ غلام محمد صاحب کو

بچوں سے غیر معمولی انس تھا۔ اور وہ یہ جانتے تھے کہ آج کے یہ بچے کل کے بڑے ادیب شاعر، دانشور اور سیاست داں ہوں گے۔ اسی اخبار سے اظہر افسر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ گو میزان کے مدیر حبیب اللہ اوج تھے لیکن اظہر افسر بچوں کا صفحہ "بھائی جان" کی حیثیت سے ترتیب دیا کرتے تھے۔

میزان کی طرح روزنامہ رہبر دکن اور آگے چل کر رہنمائے دکن میں ہر دوشنبہ کو بچوں کا صفحہ شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کی اپنی "ہماری لیگ" بھی تھی۔ ہماری لیگ میں بچوں کے خطوط کا جواب دیا جاتا اور ان کی کہانیوں کے بارے میں اچھی بری باتیں بتائی جاتیں۔ اور انھیں مشورے بھی دیئے جاتے تھے۔ رہنمائے دکن کا بچوں کا صفحہ حیدر آباد میں بے حد مقبول تھا۔ اخبار کے ملتے ہی سب سے پہلے بچے اسی صفحہ کو دیکھا کرتے۔ کہانی چھپی ہے تو سمجھئے اس روز عید ہے ورنہ بڑی مایوسی ہوتی۔ اور دوسرے دوشنبہ کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا۔ یہ میری ہی نہیں ہم سب بچوں کی کیفیت تھی۔

آزادی کے بعد بہت سے نئے اخبار مطلع صحافت پر نمودار ہوئے اور غائب بھی ہو گئے۔ لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں بھی بچوں کو انھوں نے فراموش نہیں کیا۔ روزنامہ "سیاست" اس حیثیت سے نمایاں اخبار ہے۔ آزادی کے بعد مستحکم بنیادوں پر صحافت کو عوامی زندگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ جدّت طرازی اور جدت پسندی کے ذریعہ صحافت کے خشک کو تر بنایا۔ چنانچہ بچوں کی آزاد فضا میں تربیت اور ان کے دماغ کو ترقی پسند انہ افکار کے ذریعہ وسعت دینے کے لئے اپنے صفحوں کو وقف کیا۔ لیکن افسوس یہ صفحہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا۔ تاہم نئی نسل کی ذہنی تربیت میں روزنامہ سیاست کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ملاپ کی "بال سبھا" کو وقار خلیل ایک عرصہ تک ترتیب دیتے رہے۔ "انگارہ" اور "انگارے" میں وہاب حیدر نے بہت سے بچوں کو شائع کر کے ان کی ہمت بڑھائی ہے۔ "ہمارا اقدام" اور "نیا زمانہ" میں بچوں کے صفحہ کے ترتیب کار اسد جعفری تھے۔

"نیا اقدام" اور آج کا "نیا اقدام" گو مختصر سے عرصہ کے لئے چھپے، لیکن ان میں بھی بچوں کا صفحہ ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں حبیب قادر بچوں کے پسندیدہ ترتیب کار بن گئے تھے۔ "نظام گزٹ" کا بچوں کا صفحہ متنوع ہوا کرتا تھا۔ بہر حال آٹھ دس سال تک اردو صحافت میں حیدر آبادی بچوں کی کافی چہل پہل تھی۔ اب ایسی رنگا رنگی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ان دنوں بچوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق عام ہوا۔ انجمنیں بنیں، اور ٹوٹ گئیں۔ تحریری و تقریری مقابلے منعقد ہوئے، کہانی نویسی کا مقابلہ ہوتا، نظم گوئی ہوتی، ہو گی رقصاں و شاداں نظر آتی، اب یہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔

بچوں کے رسائل کی تاریخ قدرے قدیم ہے۔ آج سے ۷۰ سال قبل مولوی عبد الرب کوکب نے سنہ ۱۹۰۸ء میں سب سے پہلے بچوں کی کہکشاں "اتالیق کے نام سے سجائی تھی۔ اتالیق اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا۔ ورنہ ۱۸۵۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۸ء تک مختلف النوع رسائل جاری ہوئے، لیکن بچوں کا کوئی رسالہ جاری نہ ہوا تھا۔ اس لئے کوکب "حیدر آباد میں بچوں کے رسائل کے باوا آدم ہیں۔ اتالیق دراصل ایک اصلاحی اور علمی رسالہ تھا۔ جب یہ تجربہ کامیاب ہوا تو بچوں کے رسائل کی طرف دیگر صحافیوں نے بھی توجہ دی۔ چنانچہ بہت سے رسائل مثلاً ادیب الاطفال سنہ ۱۹۱۱ء، المعلم سنہ ۱۹۱۴ء، نونہال سنہ ۱۹۲۱ء، تارے سنہ ۱۹۴۷ء، بچوں کی دنیا سنہ ۱۹۴۹ء، نوخیز سنہ ۱۹۵۴ء، بچپن سنہ ۱۹۵۴ء، گلشن سنہ ۱۹۵۴ء، نونہال سنہ ۱۹۵۴ء، انعام سنہ ۱۹۵۸ء، ننھا سنہ ۱۹۵۹ء، اور میرا رسالہ سنہ ۱۹۶۰ء جاری ہوئے۔ ان رسائل کے علاوہ شہر و اضلاع کے بیشتر فوقانوی مدارس اور کلیات سے بھی سالانہ رسالے جاری ہوئے۔ جن سے طلبا کی علمی، ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا پانے میں غیر معمولی مدد ملی۔ شہر کی کالجوں میں جامعہ عثمانیہ کی تحت کی تقریباً سبھی کالجوں سے سالنامے جاری ہوئے، آرٹس کالج کا مجلہ عثمانیہ پہلے سہ ماہی تھا پھر سالانہ ہو گیا۔ سٹی کالج کا الموسیٰ، سائنس کالج کا سائنس، نظام کالج کا نظام ادب، چادر گھاٹ کا سیل رواں، حیدر آباد ایوننگ کالج کا شب تاب

کے علاوہ سیف آباد سائنس کالج، انوار العلوم کالج، ممتاز کالج، نیو سائنس کالج اور دیگر کالجوں کے سالنامے کافی اہمیت رکھتے تھے۔ جب اورنگ آباد، ورنگل، اور گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ عثمانیہ کالج قائم ہوئے تو وہاں سے بھی اسی طرح کے ادبی سالنامے جاری ہوئے اور ہنوز یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہی کچھ کیفیت فوقانوی مدارس کی بھی تھی۔

احمد اللہ نے ادب الاطفال جاری کیا، دوسرے سال اس رسالہ سے رگھوناتھ درد وابستہ ہوگئے۔ اتالیق کے بعد جس رسالہ کو بچوں میں زیادہ مقبولیت حاصل رہی وہ تھا مرغوب الدین کا رسالہ "نونہال"۔ "نونہال" کی وجہ سے حیدرآبادی بچوں میں کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا ذوق و شوق عام ہوچکا تھا۔ عرصہ دراز تک یہی "نونہال" بچوں کا محبوب و مرغوب رسالہ بنا رہا۔ سرکاری سرپرستی میں المعلم جاری ہوا اور علمی و تعلیمی سطح پر کافی کامیاب رسالہ تھا۔ بچوں کی دلچسپی کی چیزوں کے علاوہ اس میں مفید اور معلوماتی مواد بھی موجود ہوتا تھا۔ لیکن عوامی دنیا میں نونہال کے بعد تارے کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ مسلم ضیائی ادب کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ تارے جاری کرکے انھوں نے بچوں کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے، تارے کتابی سائز میں رنگین چھپتا تھا اس میں ننھے ادیبوں کی تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ تاروں کے اجرا سے بچوں کی دنیا میں نئی ہلچل مچ گئی۔ مسلم ضیائی پاکستان منتقل ہوئے تو تارے بھی بند ہوگیا۔ بچوں کی دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جو ہر ساتویں روز شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک مصور رسالہ تھا۔ میزان کی بچوں کی لیگ کے تقریباً سب ہی ممبر بچوں کی دنیا سے وابستہ تھے۔ اظہر افسر نے اس رسالہ کے ذریعہ بچوں میں مطالعہ کا ذوق بڑھانے کے لئے دلچسپ کہانیاں، لطیفے، نظمیں اور کارٹون کو بھی جگہ دی۔ کتابت بھی خوبصورت نوری جلی حروف میں ہوا کرتی تھی۔ بچوں کی دنیا کے لکھنے والوں میں مصلح الدین احمد، حامد الدین محمود، افتخار احمد اقبال، وحیدہ نسیم، عفت موہانی، موسیٰ کاظم، محمود انصاری،

وقار خلیل، شمیم انصاری، صبیحہ تسنیم اور سلیمہ خاتون تھا۔ "سب رس" ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے لیکن بچوں کا "سب رس" بھی جاری کیا گیا تھا جس سے معین الدین انصاری، حمید الدین شاہد اور میکش بھی وابستہ تھے، لیکن مختصر عرصہ بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

تارے کی مسدودی کے بعد بچوں کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو "نوخیز" کی اجرا نے پورا کیا۔ منیر صفوی نے "نوخیز" جاری کر کے لکھنے والے بچوں کا نیا طبقہ پیدا کیا۔ اس رسالہ سے انوار الحق بھی وابستہ تھے۔ موسیٰ کاظم نے بچوں کی بزم بیگم بازار کے آرگن کے طور پر ہفتہ وار اخبار "بچپن" جاری کیا۔ یہ اخبار اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری تھا۔ بچوں کی بزم کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں بیگم بازار میں بچوں نے مل کر "بزم نونہالان" کی بنیاد ڈالی۔ ادبی جلسے ہوتے۔

رسالہ "نونہال" بھی الیاس شبنم اور بدر افسر کی کوششوں سے جاری ہوا۔ جس میں کہانیوں کے علاوہ افسانے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

محمود انصاری نے اسی زمانہ میں اپنا رسالہ "گلشن" جاری کیا۔ گلشن بچوں کا محبوب رسالہ تھا۔ اس میں کہانیوں اور نظموں کے علاوہ ڈرامے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ "گلشن" کتابی سائز میں رنگین سرورق کے ساتھ چھپتا تھا۔ یہ دور گویا حیدرآبادی بچوں کے عروج کا دور تھا۔ ایک ایک کر کے یہ رسالے بند ہونے لگے، جو ماہنامے بچوں کا صفحہ شائع کرتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ ہفتہ وار رسائل یا تو بند ہو گئے یا انھوں نے بچوں کا صفحہ شامل کرنا ختم کر دیا۔

ان حالات میں "ننھا" ۱۹۵۹ء میں جاری ہوا تو نئی امید بندھی۔ مسعود انصاری اس کے مدیر تھے۔ یہ ایک خوبصورت اور معیاری رسالہ تھا جو کھلونا، پھلواری کلیاں، پیام تعلیم کی صف میں جگہ پاتا تھا۔ ننھا بند ہوتے ہی گویا بچوں کے رسائل کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تاہم عظیم صدیقی نے ۱۹۶۰ء میں بچوں کا "میرا رسالہ" شائع کیا۔ لیکن یہ رسالہ اپنی اولین ساعتوں میں ہی بند ہو گیا۔

ان دنوں حیدر آباد سے بچوں کا کوئی بھی رسالہ نہیں نکلتا۔ کسی اخبار میں بھی کوئی صفحہ شامل نہیں ہے۔ جو ماہنامے نکلتے ہیں وہ بھی کورے ہیں۔ یہ ایک افسوسناک صورتِ حال ہے۔ اس کی تلافی ضروری ہے۔

خواتین کے رسائل

ویسے تو حیدرآباد کی اردو صحافت کا نقطۂ آغاز طبی اسکول کا رسالہ طبابت ۱۸۵۹ء ہے۔ لیکن خواتین دکن کا عمل دخل ۱۸۹۲ء کے بعد محب حسین کے رسالہ "معلم نسواں" سے شروع ہوتا ہے۔ مولوی محب حسین کئی حیثیتوں سے حیدرآباد کی اردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، لیکن ان تمام حیثیتوں میں ان کی وسیع النظری اور روشن خیالی قدر مشترک ہے۔ اسی وسیع النظری اور روشن خیالی نے تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ ترقی پسندی پر اکسایا ہے۔ قومی دھارے میں وہ داخل ہوئے اور بقول محترمہ زینت ساجدہ وہ حقوق نسواں کے محافظ بھی کہلائے۔ وہ تعلیم نسواں کے مؤید تھے۔ اس لئے بقول ان کے معلم نسواں نے طلب کی اور اس میں سے نو برس خاص عورتوں کی آزادی کی بہت جان توڑ کوشش کی آخر ہماری قوم کے بعض نا سمجھ اشخاص نے ہمارے منہ میں لوہے کا قفل ڈلوا دیا اور ہمارا حلق بند کرا دیا۔ اور آگے چل کر "معلم نسواں" کے آخری شمارے میں لکھتے ہیں

"اے ہماری دینی بہنو! ہم نے تمہاری آزادی فلاح و بہبودی کے لئے حتی الامکان کوشش تو کی، مگر اس کے عمدہ نتائج خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ تم اپنے خیرخواہ معلم نسواں کو بھی کبھی فراموش نہ کرنا۔ بس یہی صلہ

ہم تم سے چاہتے ہیں۔ سلام، سلام، سلام !!

"معلم نسواں" بند ہوگیا لیکن محب حسین کی کربناک آواز آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ آج جب کہ حیدر آباد کی خواتین، دنیا کی عورتوں کے ساتھ قدم بقدم ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ محب حسین کی خدمات کو فراموش نہیں کرسکتیں۔ جب بھی خواتین دکن کا ذکر آئے گا اس کی ابتدا "معلم نسواں" سے ہی ہوگی۔ "معلم نسواں" نے جو سازگار فضا پیدا کی ہے اس کے نتیجے میں حیدر آباد کی خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھتی ہی گئیں اور خود صحافتی میدان میں بھی ان کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔ معلم نسواں کے علاوہ عبدالرزاق بسمل اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنے رسالہ "شہاب" اور تصانیف کے ذریعہ خواتین کی ہمت افزائی کا فرض انجام دیتے رہے ہیں۔ بسمل صاحب مرحوم نے شہاب کے ذریعہ عورتوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے کی کوشش کی۔ جب کہ ہاشمی صاحب مرحوم نے حیدر آباد کی نامور خواتین کے تذکرے لکھ کر ان کے کارناموں کو تاریخی حیثیت دے دی ہے۔ بزم خواتین اور کتب خانہ برائے خواتین کا قیام بھی عورتوں کی ہر جہتی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ جن خواتین نے معلم نسواں کی تحریک کو اپنے رسائل و جرائد کے ذریعے آگے بڑھایا ہے ان میں صغرا ہمایوں مرزا، اہلیہ ولی اللہ، سیدہ بیگم خویشگی۔ حمید النسا اور زینت ساجدہ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ بیگم حفیظ نے اردو صحافت کی جو خدمات اپنے شوہر عبدالحفیظ کے اشتراک سے انجام دی ہیں وہ ہر طرح قابل تحسین ہیں یہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اردو روزناموں کے لیے قائم کردہ یونائٹیڈ نیوز آف انڈیا سے وابستگی اختیار کرکے خبر رسانی کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں عبدالحفیظ صاحب کا رسالہ معلومات بھی نکلتا تھا، یقیناً اس رسالہ سے بھی وہ وابستہ رہی ہیں بیگم حفیظ کے بعد خبر رسانی کے کسی بھی ادارہ سے آج تک کوئی بھی خاتون وابستہ نہیں رہی اس لئے بھی وہ حیدر آباد کی تاریخ صحافت میں منفرد مقام کی حامل ہیں۔ بیگم حفیظ کی اردو صحافت

سے وابستگی یقیناً اس زمانے میں خواتین کے لئے دعوت عمل کا باعث بنی ہوگی۔

صغرا ہمایوں مرزا۔ بیرسٹر ہمایوں مرزا کی بیگم تھیں۔ وہ حیدر آباد کی ان بزرگ خواتین میں سے تھیں جنھوں نے حیدر آبادی خواتین میں علم و شعر کا ذوق پیدا کیا۔ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں "النسأ" جاری کیا۔ یہ ایک نسوانی رسالہ تھا جو پہلی مرتبہ حیدر آباد سے شائع ہوا۔ جب صغرا ہمایوں مرزا دورہ یورپ کے لئے نکلیں تو یہ مفید رسالہ بند ہوگیا اس رسالہ کی اجرأ سے حیدر آبادی خواتین میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کا نیا جذبہ پیدا ہوا۔ جن خواتین نے "النسأ" سے قلمی تعاون کیا ان میں نوشابہ خاتون محترمہ مرزا مہدی کوکب، زہرہ اختر، بیگم انوری، قیصری بیگم اور مسز یاور علی قابل ذکر ہیں۔ اس رسالہ میں انجمن خواتین دکن کی روئیداد بھی شائع ہوا کرتی تھی۔ زنانہ ہائی اسکول سے ایک رسالہ ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا اور اس کی مدیرہ احسن النسأ تھیں۔ اس رسالہ نے طالبات میں ادبی ذوق کو پیدا کیا۔ ۱۹۲۳ء میں اہلیہ ولی اللہ نے ایک مفید رسالہ خادمہ کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۳۱ء میں خواتین کا ایک ممتاز رسالہ "ہمجولی" جاری ہوا۔ جس کی مدیرہ سیدہ بیگم خویشگی تھیں۔ "ہمجولی" خواتین کا مقبول عام رسالہ تھا اور دو سال تک یہ جاری رہا۔ اس رسالہ سے اس دور کی تقریباً سبھی خواتین وابستہ تھیں "ہمجولی" میں تعلیم اور امور خانہ داری سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ "النسأ" اور "ہمجولی" کی وجہ سے تعلیم اور ادبی تحریکات کا آغاز ہوا تھا۔ "مومنہ" کی اجرا نے دینی اور اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ صحۃ النسأ بیگم نے ۱۹۴۰ء میں اس مذہبی رسالہ کو جاری کیا۔ اس دور کا ایک اور ممتاز رسالہ "خیابان دکن" بھی ہے ۱۹۴۴ء میں حمید النسأ کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ بھی ایک ادبی اور علمی رسالہ تھا۔ "خیابان دکن" اور دیگر عورتوں کے رسائل نے حیدر آباد میں ایک خاص علمی اور ادبی فضا کو پیدا کیا۔ اور نوجوان باشعور طالبات نے بڑھ چڑھ کر علمی، ادبی، اصلاحی اور مذہبی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور شہر کا قدامت پسند طبقہ آہستہ آہستہ بے اثر ہوتا گیا خصوصاً جامعہ عثمانیہ

اور کلیہ اناث کے قیام نے تو حیدر آبادی لڑکیوں میں ایک نیا جوش اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب "خواتین دکن" نے علم و ادب کے علاوہ اصلاحی تعمیری اور قومی معاملات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ترقی پسندی اور وسیع النظری نے بہت جلد ان میں اردو صحافت کے دوش بدوش آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ ایسی خواتین جنھوں نے ترقی پسندی اور روشن خیالی کی وجہ سے نام پیدا کیا ان میں محترمہ زینت ساجدہ کا نام نمایاں ہے۔ ابھی یہ ایم اے کی طالبہ تھیں کہ صحافت سے وابستہ ہو گئیں۔ احمد مکی صاحب کی ادارت میں جو مشہور رسالہ "داستان" ۱۹۴۶ء میں نکلا۔ اس سے یہ بھی وابستہ رہیں۔ یہ ان کی شاعری کا بھی اور افسانہ نگاری کا ابتدائی دور ہے۔ آگے چل کر انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے طلبا میں اپنی ذہانت، قابلیت اور خوش مذاقی کی وجہ سے اور اردو ادب میں اپنے شگفتہ، شائستہ اور ترقی پسند انداز فکر کی وجہ سے کافی نام پیدا کیا۔ آج یہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

دیگر خواتین میں جنھوں نے اردو صحافت کے ذریعے نام کمایا ان میں اختر جہاں (ادا [illegible] ۱۹۵۲ء) سعادت جہاں رضوی۔ (تازیانہ ۱۹۵۳ء) صالحہ الطاف (خاتون دکن ۱۹۶۰ء) اور محمدی بیگم (قلمکار ۱۹۶۲ء) قابل ذکر ہیں۔ سہ ماہی "شعر و حکمت" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اختر جہاں کا نام شامل ہے۔ سعادت جہاں شعر بھی کہتی ہیں۔ محمدی بیگم کا قلمکار جلد ہی بند ہو گیا، البتہ صالحہ الطاف کا "خاتون دکن" جاری رہا۔ اس رسالہ میں خواتین کے علاوہ مرد اہل قلم کے مضامین بھی شامل رہتے تھے۔ ایک مبسوط اور جامع پالیسی کے ذریعہ خاتون دکن کو معیاری رسالہ بنا دیا مجلہ عثمانیہ شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی کا سالانہ میگزین ہے۔

۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کئی ممتاز طالب علم اس میگزین کی مجلس ادارت سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ لیکن اس لمبی مدت میں ایسی کوئی خاتون نہیں ہے جنھیں اس مجلہ کی ادارت کا موقع [illegible] البتہ ۱۹۶۷ء [illegible] طیبہ بیلی

مرتبہ شعبہ کی ایک طالبہ کو بحیثیت مدیرہ منتخب کیا گیا اس حیثیت سے زاہدہ کو حیدر آبادی صحافی خواتین میں منفرد مقام حاصل ہوا۔ ان کے زمانہ میں مجلہ عثمانیہ کا مقالہ نمبر شائع ہوا جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

آج بھی حیدر آبادی خواتین کی دو ایک بزم سرگرم عمل ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج کے اس ترقی یافتہ زمانہ میں ان کا کوئی نمائندہ ترجمان نہیں۔

خبر رساں ادارے

خبر رساں ادارے، صحافتی زندگی میں کلیدی اہمیت رکھتے تھے۔ یہی وہ ادارے ہیں، جو اخباروں کی شکم پوری کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو اخبار بے مصرف ہیں۔ حیدرآباد کی اردو صحافت میں ان اداروں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ حیدرآباد کی اردو صحافت میں ان اداروں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ خبروں کی بروقت فراہمی، ان کی صداقت، افادیت اور اختصار کی وجہ سے خبر رساں ادارے اہم اور کارکرد کہلاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز پر بھی اردو اخبار یا تو انگریزی پریس کے محتاج ہوا کرتے تھے یا پھر سرکاری گزٹ پر تکیہ کیا جاتا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں سرکاری تقاریب میں شرکت کی دعوت نامہ نگاروں کو نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے باوجود حیدرآبادی نامہ نگار وقت مقررہ مقام تقریب پہنچتے اور وہاں باہر کھڑے افراد سے تقریب کی نوعیت، شرکا کے نام اور ضروری معلومات حاصل کر کے خبر بنائی جاتی تھی۔ یہ صورتِ حال عرصہ تک جاری رہی۔

حیدرآباد میں علاقائی اور مقامی خبروں کا ادارہ سب سے پہلے امام بیگ رونق نے دکن نیوز کے نام سے قائم کیا۔ امام بیگ رونق حیدرآباد کے ممتاز صحافی تھے۔ ان کے دم سے درس القرآن ۱۹۲۹ء اور ماہنامہ "خلیق" ۱۹۳۱ء میں بھی جاری ہوئے

درس القرآن مذہبی موضوعات کا احاطہ کرتا تھا اور ماہنامہ "خلیق" میں ادبی و سیاسی مضامین کو جگہ ملتی تھی۔ ادارہ دکن نیوز کے قیام نے خبر رسانی کو فن بنا دیا، اور پیشہ بھی خبروں کی اشاعت میں چستی، غیر معمولی انہماک اور صداقت کی وجہ سے یہ ادارہ معتبر حیثیت اختیار کیا۔ اور حیدر آباد کے تقریباً سب ہی اخبار دکن نیوز کی خبروں کو شائع کرنے لگے تھے۔ امام بیگ رونق مرنجان مرنج طبیعت کے آدمی تھے۔ خبروں کو جمع کرنے کے کام کو انھوں نے ایک اہم صحافتی ذمہ داری بنایا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ واحد ادارہ تھا، جو خبریں جمع کر کے شہر کے مختلف اخباروں کو بھیجتا تھا۔ اس ادارہ سے رونق کے چھوٹے بھائی مرزا محمود بیگ بھی وابستہ تھے۔ امام بیگ رونق کے بعد یہی دکن نیوز کے ایڈیٹر رہے۔ محمود بیگ کچھ دنوں تک اسوسی ایٹیڈ نیوز سروس سے بھی وابستہ رہے۔ انتقال کے وقت وہ روزنامہ "سیاست" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان دنوں ذبیح اللہ بیگ دکن نیوز کے ایڈیٹر ہیں۔ امام بیگ رونق کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے اورینٹ نیوز کے نام سے ایک اور ادارہ قائم کیا تھا جو کیپ اسٹک قسم کی خبریں جاری کرتا تھا۔ انگریزی اخباروں میں اس کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس ادارہ سے رضا علی بھی وابستہ رہے ہیں۔ دکن نیوز کے قدیم ورکنگ جرنلسٹ بھی مغنی صدیقی اور جہاں دار افسر بھی شامل ہیں۔

گنپت راؤ نے ماڈرن نیوز کے ذریعے بائیں بازو کی خبروں کی تشہیر کا کام انجام دیا۔ بیگم حفیظ غالباً حیدر آباد کی پہلی اور آخری خاتون ہیں جو کسی خبر رساں ادارے سے وابستہ رہی ہیں۔ یہ اپنے شوہر مسٹر حفیظ کے ساتھ ان کے ادارے یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا میں کام کرتی تھیں۔ حیدر آباد کے خبر رساں اداروں میں پریس اکسچینج کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ حیدر آباد میں پریس اکسچینج ہی واحد ادارہ تھا۔ جو بیک وقت تین زبانوں، انگریزی، اردو، اور تلگو میں خبریں جاری کرتا تھا۔ اس ادارہ کا دفتر روزنامہ "میزان" کے احاطہ خسرو منزل، سیف آباد میں تھا۔

۱۹۴۵ء میں مسٹر قادر علی خاں امان نئی نے پبلک پریس قائم کیا تھا۔ جسے جہاں دار افسر اور رحیم فریادی چلاتے تھے۔ جیلانی پیراک نے اپنے ایک مضمون مسٹر رضا علی" (سیاست مورخہ ۳۱ر مئی ۱۹۷۱ء) میں رضا علی کے علاوہ عبد الحق۔ جمیل الرحمٰن، غلام جیلانی، نقش عالمی، عارف صوفی، یوسف الدین مرحوم اور جیلانی پیراک شامل ہیں۔ رضا علی اورینٹ پریس اور پریس اکسچینج سے نکل کر اپنا ایک علیحدہ ادارہ اسوسی ایٹیڈ نیوز سرویس کے نام سے قائم کیا۔ اور اس ادارہ کی ترویج و ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ اور اردو ادارہ کو انگریزی ادارہ پی ٹی آئی کا ہم پلہ بنادیا۔ چنانچہ ان کے ادارہ کی خبروں کو اردو کے علاوہ تلگو اور انگریزی اخباروں میں یکساں جگہ ملنے لگی۔ اصل میں انھوں نے خبر رسانی کے کام کو سائنٹیفک انداز دیا ان س کے ساتھ ساتھ جس دوسرے ادارہ کو اہمیت حاصل ہے وہ شیخ محمد کا قائم کردہ بھارت نیوز سرویس ہے۔ بھارت نیوز سرویس سے اکثر نوجوان صحافی وابستہ رہے ہیں۔ شیخ محمد صاحب جب سرکاری ملازمت سے منسلک ہوگئے تو ان کی جگہ اعجاز قریشی نے لی۔ اور آج بھی ان ہی کی نگرانی میں یہ ادارہ خبر رسانی کا اہم فریضہ خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں سید مصطفےٰ قادری خطیب جو بعد میں مدیر "ہمدم" کہلائے، انھوں نے وطن نیوز ایجنسی قائم کی تھی، اور اس کے بعد "رہبر وطن" ہفتہ وار جاری کیا۔ پولیس ایکشن کے بعد "ہمدم" جاری ہوا۔ آزادی کے بعد جس طرح بہت سے نئے اخبار جاری ہوئے، اسی طرح بے شمار نیوز ایجنسیاں قائم ہوئیں اور بند ہوگئیں۔ امجد باغی اور اکبر علی خاں نے انڈین نیوز قائم کیا۔ مصطفےٰ علی اکبر کی حیدرآباد نیوز سروس، شریف اسلم کی نیشنل نیوز کے بعد انور ادیب کی کرنٹ نیوز گذشتہ کئی برسوں سے کارگذار ہے۔ اور شائد یہ ادارہ اب کارکرد نہیں رہا۔ دور جدید خبر رسانی کے معاملہ میں کم و بیش وہی سہولیات رکھتا جو انگریزی زبان کے اخباروں کو حاصل ہے۔ بڑے اخباروں کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر کے ذریعے خبریں مل جاتی ہیں۔

عالمی خبروں کے لئے پی ٹی آئی، اے ایف پی، اے پی، یو این آئی اور رایٹر اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم مقامی خبروں کے لئے ان چھوٹے چھوٹے اداروں پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں متعلقہ اخبار اپنے اپنے نامہ نگاروں سے فراہمی خبر کا کام لیتے ہیں۔ دکن نیوز، بھارت نیوز، ان س، اور دیگر ادارے اس وقت مقامی اضلاعی خبروں کی تشہیر کا کام کر رہے ہیں۔ حیدر آبادی نامہ نگاروں میں کاہش حیدر آبادی نے خبروں کو ادبی رنگ دیا۔

خبر رسانی کا کام جتنا دلچسپ ہوتا ہے یہ اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ حیدر آبادی صحافتی زندگی میں نکریکل (نلگنڈہ) کا حادثہ ناقابل فراموش ہے۔ اس حادثہ میں انگریزی اور تلگو کے صحافیوں کے علاوہ اردو اخباروں اور خبر رساں اداروں سے وابستہ صحافی بھی شہید ہو گئے یا پھر زخمی ہوئے۔ عبدالرزاق عزیز (تلنگانہ نیوز) مہلوکین میں شامل تھے جب کہ اقبال حیدر (سیاست)، شاہ نوری (انگارے)، ہلال مرتضےٰ (رہنمائے دکن، بھارت نیوز) خرم نفیس (دکن نیوز) اور حفیظ یوسف (اردو نیوز) زخمیوں میں شامل تھے۔

کچھ دن ہوئے ہندوستان گیر ادارہ سماچار بھارتی نے علاقائی زبانوں کے اخباروں کو خبروں کی ترسیل کا منصوبہ بند پروگرام شروع کیا۔ آندھرا پردیش میں اس ادارہ کی طرف سے تلگو اور اردو صحافت کو ان کی اپنی زبانوں میں ساری خبریں فراہم کی جاتی ہیں۔ خبروں کی اشاعت کا ایک طریقہ کار یہ بھی ہے کہ بعض ادبی، سماجی، اور سیاسی ادارے اپنی سرگرمیوں کی خبریں بالراست اخباروں کے نام بھجواتے ہیں۔ ایسی خبریں بھی متعلقہ مدیروں کی جانچ کے بعد شائع کی جاتی ہیں۔ اخباروں میں بعض خبریں ایسی بھی نظروں سے گذرتی ہیں جو دوسرے اخباروں سے لی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سیاسی، اقتصادی، ادبی وسماجی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے خبروں کی فراہمی اور اس کی اشاعت ضروری ہے۔

کتابیات

حیدرآباد سے نکلنے والے وہ تمام رسائل وجرائد جو اس مقالے میں مذکور ہیں۔

صحافت۔ پاکستان و ہند میں، تالیف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

مجلس ترقی ادب (لاہور)

قومی زبان عبدالحق نمبر	کراچی	۱۹۶۶ء
دکن میں اردو	تیسرا تا چھٹا ایڈیشن	مولفہ نصیر الدین ہاشمی
بوستان آصفی	جلد دوم وسوم	" مانک راؤ وٹھل راؤ
ہماری زبان	یکم جنوری	۱۹۶۲ء
حیدرآباد کے ادیب	مرتبہ	زینت ساجدہ
ہماری زبان	یکم اگست	۱۹۶۲ء
" "	۸ مارچ	۱۹۶۳ء
مشیر عالم ڈائری	مرتبہ	صمصام شیرازی
پکٹوریل	حیدرآباد	
ماہ نامہ نگار	اپریل	۱۹۳۰ء
داستان ادب حیدرآباد	زور	
استاد ڈائرکٹری	سید محمد جعفری	اسٹار پریس الہ آباد (یو پی)
یادگار عہد جوبلی نمبر	حصہ اول	صمصام شیرازی

اقبال اور حیدر آباد	نظر حیدرآبادی	(کراچی۔ پاکستان)
خواتین دکن	نصیر الدین ہاشمی	
یادوں کی دنیا	ڈاکٹر یوسف حسین خان	۱۹۲۸ء
منظر الکرام	منتظر علی اشہر	۱۹۴۵ء
شمس اللہ قادری	میر احمد علی	۱۹۶۹ء
کارنامہ سروری	سرور جنگ	
خاتون دکن		نومبر ۱۹۷۱ء
تحفۃ المصنفین	قمر خلیل	۱۹۷۰ء
راہ رو اور کارواں	ڈاکٹر حفیظ قتیل	
رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری	مرتبہ	حمید الدین شاہد ۱۹۶۹ء
برگ گل	اردو کالج لاہور	(۱۹۵۷ء۔ ۱۹۵۸ء)
وزیٹ آف ماڈرن انڈیا	کے۔ ایس لال	
اے شارٹ ہسٹری آف اردو نیوز پیپرس	" " "	
بہادر شاہ ظفر	مینو قمر	
ماہنامہ آجکل دہلی	آزادی کا جشن سیمین نمبر	اگست ۱۹۷۲ء
سب رس	اکتوبر ۱۹۷۲ء	
روزنامہ سیاست تعارفی شمارہ	۱۷ر اکتوبر ۷۲ء مطابق ۱۱ر رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ	
" "	خصوصی اشاعت ۱۵ر اگست	۱۹۶۹ء
" "	" ۲۶ر جنوری	۱۹۷۶ء (ختم شد)

HYDERABAD MAIN URDU SHAFATH
1857—1960
BY
TAYEB ANSARI